عرض احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

ایک بڑے ''یوٹرن'' کی ضرورت!

نائن الیون کے بعد پاکستانی حکمران امریکہ کے آگے ایسے جھکے کہ ہر چیز اس کے قدموں میں قربان کر دی۔ حالانکہ یہ کیفیت تو اللہ کے ساتھ مطلوب ہے کہ اس کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔ پہلے یوٹرن پر حکمرانوں نے سمجھا تھا کہ شاید بات یہیں ختم ہو جائے گی' لیکن اللہ کے بجائے امریکہ کے سامنے جھکنے کی یہ سزا ملی کہ اب تو یوٹرن کی ایک سیریز ہے کہ جس کا سلسلہ رکنے میں نہیں آ رہا۔ ہمیں مجبوراً کشمیر سے بھی یوٹرن لینا پڑا ہے اور جس جدوجہد آزادی کو ہم خود جہاد کہہ رہے تھے آج اسے امریکہ کے حکم پر دہشت گردی کہنا پڑ رہا ہے۔ حتیٰ کہ انڈیا نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ کشمیر میں دراندازی رک گئی ہے۔

اسی طرح نظریہ پاکستان' جس پر ملک کی اساس اور استحکام کا دارومدار ہے' اس سے بھی یوٹرن لیا جا رہا ہے۔ نظریۂ پاکستان سے اعلانِ براءت کے طور پر مندروں کی تعمیر اور تزئین پر کروڑوں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے تاکہ پاکستان اور بھارت کے کلچر میں جو تھوڑا بہت فرق رہ گیا ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔ روشن خیالی کے خوشنما عنوان کے تحت دینی اقدار سے یوٹرن لے کر ایک نیا اسلام متعارف کرایا جا رہا ہے' جس کے ارکانِ خمسہ میں میراتھن ریس' راگ رنگ کی محفلیں اور بسنت نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ بسنت منانا اتنا ضروری ہے کہ اس کے لیے قانون سازی کی جا رہی ہے اور قومی بجٹ کا ایک قابل ذکر حصہ بسنت کے انتظامات' پتنگ بازی کے نقصانات سے بچنے کے لیے مختلف النوع اقدامات اور اس سب کے لیے اشتہار بازی پر صرف کیا جا رہا ہے۔ گویا یہی ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور شاید بسنت منانے پر ہی ملک وقوم کی سلامتی اور خوشحالی موقوف ہے۔ اسی طرح ایک طرف نصابِ تعلیم سے جہادی آیات کو کھرچ دیا گیا ہے تو دوسری طرف ملکی دستور سے اسلامی شقوں کو کھرچنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ کس کو خوش کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے' لیکن اس فرعونِ وقت کے مطالبات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ قبائلی علاقوں میں کارروائی کے لیے اب وہ

ہمیں بھی کسی خاطر میں لانے کو تیار نہیں۔ گویا ملکی خودمختاری بھی داؤ پر لگ چکی ہے۔

یہ سب ہمارے قومی جرائم کی سزا ہے۔ بحیثیت مجموعی دین سے غداری اور بے وفائی پوری قوم نے کی ہے۔ قوم کی اکثریت اللہ اور دین کو بھول کر دولت پرستی' مغربی تہذیب اور شادی بیاہ کے موقع پر ہندوانہ رسومات کو اختیار کیے ہوئے ہے۔ جب تک ہم اجتماعی توبہ نہ کریں اور ساٹھ سال سے دین قائم نہ کر کے جس مجرمانہ غفلت کا ارتکاب کیا ہے' اس کا تدارک نہ کریں ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اب تو صدر پاکستان کے لب و لہجے سے بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاید امریکہ کے سامنے ڈٹنے کا فیصلہ کن وقت آ گیا ہے' جو انہیں بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔ اب ایک ''بڑا یوٹرن'' لینا صدر مشرف اور پوری قوم کی ایک ضرورت بن چکا ہے۔ یعنی اب ہمیں اللہ کی طرف ایک بڑا یوٹرن لینا ہوگا اور امریکہ پر توکل اور بھروسہ ختم کر کے اللہ کے دامن کو تھامنا اور اسی پر توکل کرنا ہوگا۔ امریکہ کے مقابلے کے لیے ہمیں ایک بڑے مضبوط سہارے کی ضرورت ہے اور وہ سہارا اللہ کی ذات ہے۔ اگر ہم قیام پاکستان کے وقت کیے گئے وعدے کے مطابق' جس کا قائداعظم اور علامہ اقبال نے عزم کیا تھا' یہاں اسلامی نظام قائم کر دیں تو اللہ کی تائید و نصرت سے نہ صرف اپنی ایٹمی صلاحیت کی حفاظت کر سکیں گے بلکہ مثالی اسلامی ریاست کے نمونہ کے طور پر دنیا کی رہنمائی اور قیادت کے لیے مضبوط قوم بن کر اُبھریں گے۔

جامعہ حفصہ اسلام آباد کی تین ہزار باغیرت اور باپردہ طالبات نے حق کے لیے سر پر کفن باندھ کر قوم کو راہِ عمل دکھائی ہے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ حکومت مساجد و مدارس کو گرانے کا فیصلہ واپس لے' نام نہاد تحفظ نسواں بل کے بجائے حدود آرڈیننس کو بحال کرے اور ربّ کی دھرتی پر رب کا نظام قائم کیا جائے۔ ان کے یہ سارے مطالبات برحق ہیں' کیونکہ یہ ملک اسلام کے لیے بنایا گیا تھا' انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کر کے امریکہ کی غلامی کے لیے قائم نہیں ہوا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس معاملے کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی جائے۔ یہی ''یوٹرن'' وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مسلمانانِ پاکستان کو اس ''اجتماعی توبہ'' کے لیے عملی طور پر تیار کرنا اور اپنی سابقہ غفلت اور کوتاہیوں کا ازالہ کرنا ہوگا۔ حکومت کو بھی چاہیے کہ وہ طالبات کے ان مطالبوں کو سنجیدگی سے لے اور ان کی آواز کو دبانے کے لیے کوئی غلط راستہ اختیار نہ کرے' وگرنہ بدنامی اور شرمندگی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔ oo

1

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سلسلۂ تقاریر ۲

تکمیلِ رسالت اور اُس کے لوازم

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (التوبۃ:۳۳، الصف:۹) …… صدق اللہ العظیم

گزشتہ مباحث کا خلاصہ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخِ اسلام کے موضوع پر سلسلۂ تقاریر کے ضمن میں یہ دوسری نشست ہے۔ پہلی نشست میں ہم نے منصبِ رسالت اور اُس کا مقصد سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اس ضمن میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ ذہن میں مستحضر کر لیجیے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ ''ایمان'' جس کی بنیاد پر اسلام کا پورا قصر تعمیر ہوتا ہے' اُس کا حاصل اور لبِّ لباب یہ ہے کہ انسانی زندگی اصل میں وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہوگی۔ یہ زندگی جسے دُنیوی زندگی کہنا چاہیے' اُس اصل کتابِ زندگی کے صرف دیباچے اور مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی اصل حیثیت ایک امتحانی وقفے کی ہے۔ اس امتحان کے نتیجے کا اعلان یومِ آخر کو ہوگا اور پھر اس نتیجے کا ظہور پوری ابدی زندگی میں جاری رہے گا۔

دوسری بات یہ کہ اس محاسبۂ اُخروی کی اوّلین اساس وہ استعدادات فطری ہیں جو انسان میں ودیعت کی گئی ہیں' اور وہ ہیں سماعت' بصارت' عقل وشعور اور نیکی و بدی کی تمیز۔ یہ تو بنیادی استعدادات ہیں جن سے مسلح ہو کر انسان اس دارالامتحان میں وارد

ہوا۔ اس سے آگے بڑھئے تو آئینۂ قلب ہے جو آئینۂ جہاں نما ہے۔ اس میں معرفتِ ربّانی بھی موجود ہے اور محبتِ خداوندی کی آگ بھی سینے میں سلگتی رہتی ہے۔ انسان میں روحِ ربّانی بھی ہے جس کی وجہ سے اس کا رجحان عالمِ علوی یا عالمِ ملکوت کی طرف رہتا ہے۔ مغربی مفکرین نے بھی انسانی شخصیت کے اس پہلو کا مشاہدہ کیا اور اسے Divine Spark سے تعبیر کیا' جسے ہم ''شعلۂ ملکوتی'' کا نام دے سکتے ہیں۔ اقبالؔ کہتا ہے: ؎

ہے ذوقِ تجلّی بھی اِسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ اِدراک نہیں ہے!

انسان کو صرف حواسِ خمسہ دے کر نہیں بھیجا گیا' اور بھی بہت سی استعدادات ہیں جو اس میں ودیعت کی گئیں۔ ان کی بنیاد پر ہر انسان اس امتحان میں مبتلا کیا گیا ہے' وہ مسئول ہے' جواب دہ (accountable) ہے' مکلّف ہے۔

تیسری بات جو عرض کی گئی' یہ تھی کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ رحمتِ خداوندی کا مظہر ہے۔ انسان اگرچہ مسئول اپنی فطری استعدادات کی بنیاد پر ہے' لیکن رحمتِ خداوندی نے نبوت و رسالت' وحی اور انزالِ کتب کا سلسلہ انسان کی ان فطری استعدادات کو تقویت پہنچانے کے لیے جاری کیا۔ اس کے قلب میں نورِ معرفت موجود ہے' لیکن وہ دھندلا جاتا ہے' اس پر غبار آ جاتا ہے اور آئینۂ قلب مکدّر ہو جاتا ہے۔ رحمتِ خداوندی متقاضی ہوئی کہ انسان کے آئینۂ قلب کو منور کرنے کے لیے اس پر نورِ وحی اتارا جائے۔

تخلیق کے متعلق ایک بڑا پیارا شعر ہے: ؎

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم!

سلسلۂ خلق بھی رحمتِ خداوندی کا مظہر ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی مزید رحمت نبوت و رسالت' انزالِ وحی اور بعثتِ انبیاءؑ کی شکل میں ہوئی تاکہ ان استعداداتِ فطری کو تقویت حاصل ہو۔ اس کا حاصل سورۃ النساء کی آیت ۱۶۵ کی روشنی میں عرض کیا جا چکا ہے کہ رسولوں کو مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا گیا تاکہ انسان کے پاس اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں

کوئی حجت‘ کوئی عذر‘ کوئی بہانہ یا کوئی دلیل باقی نہ رہ جائے۔ اسے قطع حجت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اتمامِ حجت سے بھی۔ اس نورِ وحی کے بعد‘ بعثتِ انبیاءؑ کے بعد‘ ارسالِ رُسلؑ کے بعد‘ انزالِ کتب کے بعد اب کسی کے پاس اپنی غلط روی کے لیے کوئی عذر موجود نہیں۔ چنانچہ انبیاء و رُسل علیہم السلام اُمتوں کے محاسبے کے وقت قیامت کے دن عدالتِ اُخروی میں سرکاری گواہوں کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔ وہ گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیری ہدایت جو ہم تک پہنچی ہم نے بلا کم و کاست ان تک پہنچا دی۔

اس کے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک تو مَیں عرض کر چکا ہوں کہ رسولوں کی آمد کے بعد نہ صرف یہ کہ آخرت میں انسان کے پاس کوئی عذر نہیں رہے گا‘ بلکہ اس دنیا میں بھی جس قوم کی طرف رسول کو بھیج دیا جائے اس کو پھر کوئی رعایت نہیں دی جاتی‘ اس کا فیصلہ چکا دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ رسول کی آمد کے بعد بھی کوئی قوم اپنی کج روی پر مصر رہے‘ اپنی غلط روی پر اڑی رہے‘ اپنے کفر اور شرک کے اوپر قائم رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب اس میں خیر کا کوئی پہلو باقی نہیں رہا۔ اب یہ خس و خاشاک کی مانند ہے۔ یہ زمین کی پیٹھ کا بوجھ ہے جس سے اس کو نجات دلا دینے ہی میں عافیت ہے۔ چنانچہ رسولوں کی بعثت کے بعد اگر کوئی قوم اعراض و انکار پر اڑی رہی تو اس پر عذابِ استیصال آیا جس سے وہ قوم نیست و نابود کر دی گئی۔ چنانچہ قومِ نوحؑ‘ قوم ہودؑ‘ قوم صالحؑ‘ قوم شعیبؑ‘ قوم لوطؑ اور آلِ فرعون کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے کہ یہ سب قومیں نیست و نابود کر دی گئیں۔

اس کا ایک اور نتیجہ بھی ہے‘ اسے بھی ذہن نشین کر لیجیے۔ چونکہ بعثتِ رسلؑ سے مقصود ہے اتمامِ حجت‘ لہٰذا رسولوں کے باب میں اللہ کی سنت یہ قرار پائی کہ ہر قوم میں اُسی میں سے کسی کو رسول بنا کر کھڑا کیا جائے‘ تاکہ کوئی اجنبیت کا پردہ اور مغائرت کا حجاب درمیان میں حائل نہ رہے۔ اس بنا پر انسانوں کے پاس انسان ہی رسول بنا کر بھیجے گئے اور اکثر و بیشتر اُسی قوم کے افراد ہی کو بھیجا گیا‘ از روئے الفاظِ قرآنی: **وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ..... وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صَالِحًا ..... وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا.....** استثناءات تو کوئی ہوں گی‘ لیکن قانون یہی ہے کہ اُسی قوم کا کوئی فرد ہو‘ جس کی زندگی

اُن کی نگاہوں کے سامنے گزر رہی ہو‘اس کی سیرت و کردار‘اس کی امانت وصداقت کے وہ خود گواہ ہوں اور وہ اُن ہی کی زبان بولتا ہوا آئے۔ گویا اتمامِ حجت بتمام وکمال ہو جائے۔ یہ ہے بعثت رُسلؑ سے اصل مقصود۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا ’’تاریخِ اسلام‘‘ کا دراصل آغاز ہوتا ہے حضرت آدم علیہ السلام سے۔ وہ پہلے انسان بھی ہیں اور پہلے نبی بھی۔ چنانچہ تاریخ انسانیت اور تاریخ نبوت بالکل متوازی ہیں۔ قافلۂ انسانیت بھی ارتقائی منازل طے کرتا رہا اور نبوت نے بھی ارتقائی منازل طے کیں۔ البتہ میں عرض کر چکا ہوں کہ جہاں تک نبی کے اپنے ذاتی شعور کا تعلق ہے وہ وہبی ہوتا ہے‘ اکتسابی نہیں ہوتا۔ ذاتی طور پر حضرت آدم علیہ السلام کا شعور مکمل تھا‘ لیکن بحیثیتِ مجموعی نسلِ آدم نے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پر عہد طفولیت بھی آیا ہے‘ عقل وشعور کی پختگی کا دَور بھی آیا ہے اور اس کی نسبت سے وحی نازل ہوتی رہی ہے‘ کتابیں اترتی رہی ہیں۔ تاہم شرائع میں فرق ہوتا رہا ہے‘ تفصیلی احکام بدلتے رہے ہیں۔ ایک طرف قافلۂ انسانیت ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ قافلۂ نبوت بھی ارتقائی مراحل سے گزر رہا تھا‘ تا آنکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نبوت اپنے کمال کو پہنچ گئی‘ رسالت اپنے تکمیلی مرحلے تک پہنچ گئی۔ نتیجتاً نبوت ختم ہوگئی۔ میں یہ بات بتکرار واعادہ عرض کر رہا ہوں کہ ختم نبوت اپنی جگہ اٹل ہے‘ مگر اس کا اہم تر پہلو اتمامِ نبوت اور تکمیل رسالت ہے جو حضرت محمد ﷺ پر ہوئی۔

سیرت کے فہم میں اپنوں اور غیروں کی کوتاہی

آج سب سے پہلے تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس اتمامِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے فہم میں اپنوں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں اور دوسروں نے بھی بڑی زبردست غلطیاں کی ہیں۔ میں دوسروں کا ذکر پہلے کر رہا ہوں جنہوں نے اس معاملے میں بڑی کوتاہ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ ٹائن بی (۱۸۸۹ء تا ۱۹۷۵ء) دَورِ حاضر کا ایک اہم تاریخ نگار ہے اور فلسفۂ تاریخ کے حوالے سے اس کا ایک مسلّمہ مقام ہے۔ اس شخص نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایک

بڑا زہر آلود جملہ کہا تھا اور یہ ایک جملہ ایک پوری ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے:

"Muhammad failed as a prophet but succeeded as a stastesman."

''محمد (ﷺ) ایک نبی کی حیثیت سے تو ناکام ہو گئے' لیکن ایک مدبر اور سیاست دان کی حیثیت سے کامیاب ہوئے''۔

تنقید کا اصول یہ ہے کہ وہ ہمدردانہ ہونی چاہیے' یعنی جس شخص کی بات پر آپ تنقید کر رہے ہیں پہلے ہمدردی کے ساتھ اس کی بات سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے' پھر جو نقد و جرح آپ کو کرنی ہو کیجیے۔ تو ذرا ہمدردانہ طور پر سمجھئے کہ اس نے کیا کہا ہے' کیا کہنا چاہا ہے' اس کے ذہن کی اصل الجھن کیا ہے! اُس کا جو تصورِ نبوت ہے وہ کیا ہے؟ وہ عیسائی ہے' اور انسان خواہ کتنا ہی ملحد ہو جائے مذہبی روایات اس کا ساتھ نہیں چھوڑا کرتیں' وہ انسان کے فکر کے اندر رچی بسی ہوتی ہیں۔ بہرحال وہ عیسائی ہے' اس نے تورات پڑھی ہے' انجیل پڑھی ہے' نبوت کا ایک تصور اس کے ذہن میں بنا ہے۔ اس تصورِ نبوت میں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ سما نہیں رہی۔ وہ بہت چھوٹا سانچہ ہے۔ اس لیے کہ وہ نبوت کا سانچہ ہے' ختم نبوت کا نہیں ہے' اتمامِ نبوت کا نہیں ہے' تکمیل رسالت کا نہیں ہے۔ مستشرقین اس بات سے تولنا چاہ رہے ہیں محمد عربی ﷺ کو کہ جس سے آپ ﷺ کو تولا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا وہ اپنے فہم کے مطابق دیکھتے ہیں تو آنحضور ﷺ کی مکی زندگی تو ان کے نبوت کے سانچے میں فٹ بیٹھتی ہے' جہاں دعوت ہے' تبلیغ ہے' وعظ و نصیحت ہے' کچھ حواریین یعنی صحابہؓ ہیں' ان کی تربیت ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو ہِ زیتون پر وعظ فرما رہے ہیں اور نبی اکرم ﷺ کو ہِ صفا پر وعظ فرما رہے ہیں۔ چنانچہ انہیں مطابقت نظر آتی ہے۔ حضرت مسیحؑ کے ساتھ چلتے پھرتے حواری ہیں' شام یہاں' صبح وہاں۔ یہاں بیتِ ارقم ہے' تعلیم و تربیت کا ایک مرکز ہے۔ اگر حضرت مسیحؑ کو ستایا جا رہا ہے تو یہاں نبی اکرم ﷺ کو بھی ستایا جا رہا ہے اور وہ بھی اپنے ستانے والوں کو دعائیں دے رہے ہیں۔ یہاں تک تو بات ان کی سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اس کے بعد جو مدنی دَور ہے وہ ان کے کسی سانچے میں فٹ نہیں بیٹھتا۔

ان کے ہاں انبیاء کا جو نقشہ ہے وہ ذہن میں رکھیے۔ عیسائیوں کے لیے نبوت کا آئیڈیل حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں۔ یہ مَیں نے اس لیے کہا کہ حضرت مسیح علیہ السلام تو ان کے نزدیک نبی سے برتر کچھ اور شے ہیں۔ اگرچہ عیسائیوں میں بھی ایک قلیل طبقہ موحدین کا رہا ہے۔ اب بھی Jehovah's Witnesses کے نام سے کچھ لوگ موجود ہیں جو تثلیث کے قائل نہیں ہیں اور حضرت مسیحؑ کو صرف رسول مانتے ہیں۔ تو ان میں سے عام لوگوں کے اعتبار سے حضرت یحییٰ علیہ السلام اور ان موحدین کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبوت کا کامل نمونہ ہیں' اور ان دونوں کی زندگی میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی کی کوئی جھلک انہیں نظر نہیں آتی۔ انہیں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مکی دَور تو اس کے مطابق نظر آتا ہے اور یہاں ان کے قول کے مطابق' آپؐ ناکام ہو گئے اور مکہ سے نکلنا پڑا۔ چنانچہ اس نے لکھ دیا کہ آپؐ بحیثیت نبی ناکام ہو گئے۔ (معاذ اللہ!)

لیکن محمد عربی ﷺ کے مدینے میں آنے کے بعد انہیں یہ نظر آتا ہے کہ یہاں آپؐ کی ایک بالکل دوسری شان ہے۔ اب آپؐ ایک statesman ہیں' ایک مدبر ہیں' ایک سیاست دان ہیں' ایک سپہ سالار ہیں۔ یہ حیثیتیں ہیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی جو نمایاں ہو کر سامنے آ رہی ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے ٹائن بی کا کہنا ہے کہ آپؐ کامیاب ہو گئے۔

برطانوی پروفیسر منٹگمری واٹ (۱۹۰۹ء تا ۲۰۰۶ء) نے سیرت النبی ﷺ پر دو کتابیں لکھیں:

1- *Muhammad at Mecca (1953)*
2- *Muhammad at Medina (1956)*

اس کے بعد اس نے ان دونوں کتابوں کا لبِّ لباب اپنی کتاب "Muhammad: Prophet and Statesman" کی صورت میں پیش کیا۔ (ہمارے ہاں اس مصنف کو ضیاء الحق صاحب نے سرکاری سطح پر منائی جانے والی سیرت کانفرنس میں بطورِ خاص بلایا تھا)۔ منٹگمری واٹ کی کتابوں کے عنوانات ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے ذہن میں وہی تخصیص ہے کہ محمد ایک نہیں ہے' دو محمد ہیں (ﷺ)۔ یا یوں کہہ لیجیے (نعوذ باللّٰہ من ذٰلك) یہ ایک انسان کے دو چہرے اور دو روپ ہیں اور اس نے ان کا

فرق (contrast) نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے کچھ نیک دل اور سادہ لوح لوگ ان تعریفوں پر خوش ہو جاتے ہیں جو اُس نے آنحضورﷺ کے تدبر، دُور اندیشی اور معاملہ فہمی پر کیں۔ حالانکہ اس کی کتابوں میں زہر چھپا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ محمدؐ اگر قابل تعریف ہیں تو بحیثیت مدبر ہیں، بحیثیت سیاست دان ہیں، بحیثیت سپہ سالار ہیں، بحیثیت ایک دُور اندیش اور معاملہ فہم انسان ہیں، محمدﷺ کی تعریف بحیثیت رسول نہیں ہے۔ یہ اصل میں وہ زہر ہے جو اُس میں پنہاں ہے۔ بہرحال یہ تو وہ ٹھوکریں ہیں جو اوروں نے کھائیں، کچھ جان بوجھ کر بھی کھائیں، کچھ تعصب کے پردے بھی حائل رہے۔

ہمارے ہاں تصویر کا ایک بالکل دوسرا رُخ نظر آتا ہے۔ ہمارے سارے مطالعۂ سیرت، ساری تقاریر سیرت اور محافلِ میلاد کے سارے بیانات کا حاصل اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ ایک بالکل مافوق الفطرت (super natural) یا مافوق البشر ہستی کا تصور سامنے آتا ہے۔ انسانی سطح (human level) پر نبی اکرمﷺ کو سمجھنے اور آپؐ کے اصل کارنامے کی عظمت کو جانچنے کی ہمارے ہاں کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ ہماری ایک سیرت کانفرنس میں مفتی محمد حسین صاحب نعیمی نے ایک بہت عمدہ جملہ کہا تھا کہ ''اللہ کی صرف اطاعت ہوگی اور محمدﷺ کی اطاعت بھی ہوگی، اتباع بھی ہوگا''۔ دیکھئے، کتنی خوبصورتی سے اللہ کی اطاعت اور اُس کے رسولﷺ کی اطاعت میں فرق واضح کر دیا گیا۔ اللہ جو کچھ کہتا ہے وہ تمہیں کرنا ہے، اور جو کچھ وہ کرتا ہے اسے تم کر ہی نہیں سکتے۔ وہ تو خالق ہے، اس کی شان تو کُن فیکون ہے، وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ تو اس کا اتباع کیسے کرو گے؟ اُس کی تو صرف اطاعت ہے۔ وہ کہتا ہے یہ کرو، وہ کرو، یہ حلال ہے، وہ حرام ہے، مان لیا تو اطاعت ہوگئی۔ مگر نبی اکرمﷺ کے ساتھ رشتہ جدا ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ بھی کرنا ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ بھی کرنا ہے۔ بہت پیاری بات ہے۔ لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ سیرت کا وہ نقشہ لوگوں کے سامنے لایا جائے کہ محمدؐ رسول اللہﷺ نے جو کچھ کیا انسانی سطح پر کیا۔ ان تمام موانع کے علی الرغم کیا جو کسی بھی انسان کو پیش آ سکتے ہیں۔ ان تمام مصائب اور تکالیف کو جھیل کر کیا

جو کسی بھی انقلابی جدوجہد میں پیش آتے ہیں۔ بقول شاعر: ؎

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار

ہمارے ہاں سیرت النبی ﷺ کا بالعموم جو نقشہ پیش کیا جاتا ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کو ایک قابل پرستش وجود بنا دیا گیا ہے۔ لیکن وہ نقشہ سامنے نہیں آتا کہ جس سے کوئی درسِ عمل ملے، جس سے کچھ کرنے کا داعیہ پیدا ہو، جس سے آپؐ کے نقشِ قدم کے اتباع کا جذبہ ابھرے۔ یہ دو انتہائیں ہیں اور ان دونوں کے بین بین ہے سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

سیرت النبی ﷺ کے صحیح فہم کے لیے سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ کے اصل کارنامۂ حیات کا تعین ضروری ہے۔ اور یہ جان لیجیے کہ جس شخص کے بھی کارنامۂ حیات کو آپ جانچنا (assess کرنا) چاہیں، پہلے معین کرنا ہوگا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ تب ہی تو معلوم ہوگا کہ کس حد تک اس کی تکمیل ہوئی اور کس طرح سے تکمیل ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے ضمن میں قرآن حکیم کی یہ آیت نہایت اہم ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

اس آیت کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے۔ یہ الفاظ قرآن مجید میں تین مقامات پر جوں کے توں بغیر کسی ایک شوشے کے فرق کے وارد ہوئے ہیں۔ دو مقامات پر اس کے بعد اِن الفاظ کا اضافہ ہے: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (التوبۃ:۳۳ والصّف:۹) جبکہ ایک مقام پر الفاظ آتے ہیں: ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾ (الفتح)

قرآن مجید میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ متذکرہ بالا الفاظ بعینہٖ بغیر کسی شوشے کے فرق کے قرآن مجید میں تین مرتبہ آئے ہیں۔ ان الفاظ کی اہمیت اسی سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ذخیرۂ الفاظ (vocabulary) کی کمی نہیں اور عربی زبان کا دامن بھی تنگ نہیں۔ اس کے

باوجود انہی الفاظ کو تین بار دہرا کر لانا یقیناً ان الفاظ کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ پھر دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے لیے تین دفعہ آئے ہیں' جبکہ کسی دوسرے رسول کے لیے ایک مرتبہ بھی نہیں آئے' بلکہ اس کے آس پاس کے الفاظ بھی نہیں آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان آیات کا خصوصی تعلق بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ہے۔ رسالتِ محمدیؐ کی غرض وغایت کے لیے یہ الفاظ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

''اِزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء'' امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ایک بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے' جس میں شاہ صاحبؒ نے خلافت پر گفتگو کی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے چند آیات کو بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے' ان میں یہ آیت سرفہرست ہے۔ بلکہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ شاہ صاحب کی تصانیف میں انہیں کسی جگہ یہ جملہ بھی ملا کہ یہ آیت پورے قرآن مجید کا محور اور عمود ہے' اس کو سمجھ کر پڑھیں گے تو قرآن مجید سمجھ میں آئے گا۔ گویا یہ فہم قرآن کے لیے کلید ہے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ اس آیت کے فہم قرآن کے لیے کلید ہونے میں تو شاید کسی قدر اختلاف کی گنجائش نکل آئے' تاہم سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے فہم کے لیے یہ یقیناً محور اور عمود بھی ہے اور کلید بھی۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اسے اسلام کے عالمی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔

اب اس آیت پر غور کیجیے: ﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ﴾ ''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو''۔ هُوَ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ سابقہ آیات میں اللہ کا ذکر صراحت سے آیا ہے۔ سورۃ الصّف اور سورۃ التوبۃ میں اس سے متصلاً پہلے جو آیت ہے اس میں ذرا سا لفظی فرق ہے۔ سورۃ الصّف میں الفاظ آئے ہیں:

﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾

''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ (کی پھونکوں) سے بُجھا دیں' جبکہ اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا' خواہ ان کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو!''

اگلی آیت کا مضمون اس سے مربوط ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی﴾ ''وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو''۔ ''رسول'' کوئی مشکل لفظ نہیں ہے۔ اَرْسَلَ یُرْسِلُ اِرْسَالًا کا معنی بھیجنا ہے۔ اردو میں یہ لفظ عام طور پر بولا جاتا ہے' مثلاً خط ارسال کیا' آپ کا مرسلہ ملا' وغیرہ۔ اس سے مفعول مُرْسَلٌ بنتا ہے اور لفظ رسول اس معنی میں صفتِ مشبّہ ہے۔

ایک بات اور نوٹ کیجیے کہ انبیاء و رُسل میں سے جن کو اولوالعزم کہا گیا ہے وہ خصوصی مرتبے اور شان کی حامل برگزیدہ ہستیاں ہیں' ان کے ساتھ کچھ نسبتیں معروف ہیں' مثلاً آدم صفی اللہ' نوح نجیّ اللہ' ابراہیم خلیل اللہ' اسمٰعیل ذبیح اللہ' موسیٰ کلیم اللہ' عیسیٰ روح اللہ اور محمد رسول اللہ (ﷺ) یعنی جامۂ رسالت بتمام و کمال شخصیت محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر راست آتا ہے۔ آپؐ کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ آپ رسول ہیں۔ گویا خلتِ الٰہی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی حضرت ابراہیم پر (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام)۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے براہِ راست کلام فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝﴾ (النساء) قرآن مجید میں دوسرے انبیاء و رُسل کی عظمت کے جو پہلو ہیں ان کو چھپایا نہیں گیا بلکہ اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ تو ہماری تنگ نظری ہے کہ جب ہم سیرت النبی ﷺ کا بیان کرنے پر آتے ہیں تو اس طور سے کرتے ہیں کہ دوسرے رسولوں کی تنقیص کر گزرتے ہیں' حالانکہ یہ بات تو ہمارے ایمان کا جزو ہے کہ ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ ''ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے مابین بھی تفریق نہیں کرتے''۔ اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی تواضع کا یہ عالم ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے یونس بن متّی پر بھی فضیلت مت دو۔[1] انبیاء و رُسل علیہم السلام کی کل جماعت میں سے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے' حضرت یونس علیہ السلام واحد نبی ہیں

---

(۱) عن ابی هريرة رضی اللّٰه عنه عن النبی ﷺ قال: ((لَا يَنْبَغِیْ لِعَبْدٍ اَنْ يَقُوْلَ اَنَا خَيْرٌ مِنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی)) (صحيح البخاری' كتاب احاديث الانبياء' باب قول اللّٰه تعالیٰ: **وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ** الخ)

جن سے یہ خطا ہوگئی تھی کہ حکمِ خداوندی کے آنے سے پہلے قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس پر اس دنیا میں گرفت ہوئی اور مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ اس کے بعد توبہ کی تو توبہ قبول ہوئی اور انہیں وہاں سے نجات ملی۔

قرآن میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے: ﴿وَاٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ﴿۱۶۳﴾﴾ (النساء) ''اور ہم نے داؤد کو زبور دی''۔ ''زبور'' حمد الٰہی کے وہ ترانے ہیں جن کی مثل دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ حضرت داؤدؑ جب حمدِ الٰہی کے ترانے الاپا کرتے تھے تو پہاڑ وجد میں آ جاتے تھے' پرندے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے' یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر ایک خاص احسان تھا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ رات کے وقت' جبکہ آپؐ ان کے مکان کے پاس سے گزر رہے تھے' لحنِ داؤدی کے ساتھ قرآن مجید پڑھتے سنا' آپ ﷺ کافی دیر تک کھڑے سنتے رہے' صبح ملاقات ہوئی تو فرمایا: ((یَا اَبَا مُوْسٰی لَقَدْ اُوْتِیْتَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِیْرِ آلِ دَاوٗدَ))(۱) ''اے ابوموسیٰ! اللہ نے تمہیں تو آلِ داؤد کے سازوں میں سے ایک ساز عطا کیا ہے!'' تو رسول اللہ ﷺ نے باقی انبیاء و رُسل کے فضائل کو اُجاگر فرمایا ہے۔

الھُدٰی —— ہدایت آسمانی کی تکمیلی صورت

میں نبوت و رسالت کے فرق کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ نبوت ایک ذاتی حیثیت ہے اور رسالت ایک منصب ہے۔ یہ منصبِ رسالت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی میں اپنے عروج کو پہنچا۔ فرمایا: ﴿ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ﴾ ''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو'' ﴿ بِالۡھُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ﴾ ''ہدایت کاملہ اور دینِ حق کے ساتھ''۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا ہے۔ ایک ''الھُدٰی'' اور ایک ''دین الحق''۔ ''الھُدٰی'' کے بارے میں تقریباً اجماع ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ انسانی فکر اور انسانی سوچ کے لیے ابدالآباد تک کامل راہنمائی کے لیے یہ قرآن

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب حسن الصوت بالقراءۃ للقرآن۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب استحباب تحسین الصوت بالقرآن۔

دیا گیا ہے۔قرآن مجید اپنے لیے لفظ ہدایت گویا اسمِ علَم کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ یہ هُدًى لِّلنّاس ہے' هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے۔ یہاں دونوں جگہ لفظ هُدًى بطور اسم آیا ہے۔سورۂ بنی اسرائیل میں یہی لفظ فعل کی صورت میں آیا ہے: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ (آیت ۹)۔آیت زیر مطالعہ میں لفظ ''الھُدٰی'' آیا ہے' یعنی کامل ومکمل ہدایت۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ نوعِ انسانی کے قافلے نے ارتقاء کا سفر طے کیا ہے اور تقریباً ۷۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۶۰۰ بعد مسیح تک انسانی سوچ اپنی پختگی کو پہنچ گئی۔اس دوران انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا۔اس میں فلاسفۂ یونان بھی آ گئے اور فلاسفۂ ہند بھی۔ گوتم بدھ اور مہاویر بھی آ گئے اور کنفیوشس بھی آ گیا۔غرض جتنے حکماء و فلاسفہ' اہل منطق اور دوسرے سوچنے والے لوگ تھے' اس تقریباً تیرہ سو سال کے عرصہ میں پیدا ہو گئے' اور اب نوعِ انسانی کو یہ ''الھُدٰی'' دے دی گئی۔تورات ہدایت نامہ ضرور تھی' الہدیٰ نہیں تھی۔اگر وہ الہدیٰ یعنی کامل ومکمل ابدی ہدایت ہوتی تو اس کو محفوظ کر لیا جاتا۔مگر اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہیں لیا' وہ محفوظ نہیں رہی۔ حالانکہ کتاب بہرحال وہ بھی اللہ ہی کی تھی' اور اللہ اگر اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیتا تو کون اس میں تحریف کر سکتا تھا؟ لیکن نہیں' اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا' اس لیے کہ ابھی یہ ہدایت ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی۔سورۃ الحدید کی یہ آیت بڑی اہم ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ.....﴾ (آیت ۲۵) ''ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان.....''

جب انسان اپنے ذہنی بلوغ کو پہنچ گیا تو کتابِ ہدایت کا آخری ایڈیشن ''الہدیٰ'' کی صورت میں اسے تھما دیا گیا۔اگر اس کے بعد بھی انسان کو کوئی مزید ہدایت دی جانی ہوتی' اور اس میں کسی اضافے کا کسی پہلو سے کوئی امکان ہوتا تو ابھی ختم نبوت غیر منطقی بات ہو جاتی۔ یہ وہی انسان کے ذہنی بلوغ کا معاملہ ہے جسے علامہ اقبال نے ختم نبوت کے لیے بطورِ دلیل استعمال کیا ہے۔انسانی ذہن کے ارتقاء اور عقلی بلوغ کا جو مرحلہ آ گیا

تھا اس کا تقاضا تھا کہ انسان اب اس عہد طفولیت سے نکل چکا ہے جہاں قدم قدم پر اسے کہا جائے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ اس میں یہ استعداد پیدا ہو چکی تھی کہ اب اسے جامع اور کامل ہدایت دے دی جائے' ایک بنیادی ہدایت نامہ دے دیا جائے' اور اس کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھول دیا جائے کہ جیسے جیسے حالات بدلیں' اب اجتہاد کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید دَور کا انسان اپنی نفسیاتی ساخت کے اعتبار سے بہت زیادہ احکام اور بہت زیادہ تفصیلی ہدایات کو پسند نہیں کرتا۔ جس طرح ایک بالغ نظر شخص اس کو پسند نہیں کرے گا' بلکہ اپنی توہین سمجھے گا کہ ایک ایک جزئی تفصیل اس کو بتائی جائے' اسی طرح نسل انسانی کے عقلی بلوغ کا یہ تقاضا تھا کہ ایک جامع ہدایت دینے کے بعد اب انسان کو ایک آزادی دی جائے۔ چنانچہ علامہ نے تو یہ بات بھی لکھی ہے کہ شخصی اطاعت اب ختم ہو چکی ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نبی شخصاً مطاع ہوتا ہے' وہ اپنی ذات میں مطاع ہے' اس کی اطاعت لازم ہے۔ نوعِ انسانی اب عقلی بلوغ کی اس سطح پر پہنچ چکی تھی کہ شخصی اطاعت اس پر گراں گزرنے والی تھی۔ لہٰذا علامہ نے کہا ہے کہ ختم نبوت کے بعد اب کوئی شخص اپنی ذاتی حیثیت میں مطاع نہیں رہا۔ اب کتاب وسنت ہمارے پاس ایک علمی سرمایہ ہے۔ کوئی شخصِ معین اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا کہنا مانو' میری اطاعت کرو۔ وہ سلسلہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو گیا۔ نبوت بلاشبہ شخصی اطاعت کو لازم کرتی ہے۔ نبی کی ہر بات' اس کے چشم وابرو کی ہر حرکت حکم ہے۔ بلکہ نبی کا تو ہر عمل بھی' خواہ اس نے اس کا حکم نہ دیا ہو' واجب الاتباع ہے۔

''دِین الحَقّ'' کا مفہوم

محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو ''الھدیٰ'' کے ساتھ جو دوسری چیز دی گئی وہ ہے ''دِین الحق''! یہ دینِ حق دو الفاظ سے مل کر بنا ہے اور بظاہر مرکب اضافی ہے (حق کا دین)' لیکن عام طور پر اس کا ترجمہ ''سچا دین'' مرکب توصیفی کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں مرکب توصیفی بشکلِ اضافت بھی آ جاتا ہے۔ مرکب اضافی کی صورت میں اس کے معنی ہوں گے ''حق کا دین''۔ حق کون ہے؟ از روئے قرآن ذاتِ حق سبحانہ

وتعالیٰ صرف ایک ہے۔ سورۃ الحج میں الفاظ آئے ہیں: ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الۡحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ھُوَ الۡبَاطِلُ﴾ (آیت ۶۲) ''یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور جس کو یہ پکارتے ہیں اس کے سوا وہی باطل ہے۔'' چنانچہ الحق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ ''دین الحق'' مرکب اضافی بنائیے تو معنیٰ ہوں گے ذاتِ حق کا دین یعنی اللہ کا دین' اور اگر اس کو مرکب توصیفی سمجھا جائے تو معنی ہوں گے ''سچا دین''۔

اب لفظ دین کی طرف آئیے۔ دَانَ یَدِیۡنُ عربی زبان میں بدلے اور اطاعت کے لیے آتا ہے۔ اس کا بالکل بنیادی مفہوم بدلہ اور جزاء وسزا ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں' جو اساس القرآن اور اُمّ القرآن ہے' یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے: ﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ﴾۔ اس کا مطلب ہے ''بدلے کے دن کا مالک' جزاء وسزا کے دن کا مالک''۔ عربی زبان کی ایک کہاوت ہے: ''کَمَا تَدِیۡنُ تُدَانُ'' یعنی ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے''۔ اور ایک بہت مشہور مصرع ہے: ''فَدِنَّاھُمۡ کَمَا دَانُوۡا'' کہ جیسے انہوں نے ہمارے ساتھ سلوک کیا ہم نے بھی اُن کے ساتھ ویسا ہی کیا!

بدلہ اور جزاء وسزا کے مفہوم سے اب یہ لفظ ذرا اور اوپر اٹھتا ہے۔ جزاء وسزا کے ساتھ لازم وملزوم ہے کوئی قانون' کوئی ضابطہ' جس کی پابندی کی جائے تو جزا ہے' خلاف ورزی کی جائے تو سزا ہے۔ لہٰذا لفظ ''دین'' قانون کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ مزید برآں ''دین'' اطاعت کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر ذہن میں رکھیے کہ قرآن مجید کی اصطلاح کے طور پر ''دین'' سے مراد ہے ایک پورا نظامِ زندگی' ایک منظّم زندگی۔ اور منظّم زندگی کے لیے لازم ہے کہ اس میں مطاع کا تعین کیا جائے۔ اب یہ بات پولیٹیکل سائنس کے طلبہ بڑی آسانی سے سمجھیں گے کہ کسی ملک کے سیاسی نظام میں سب سے پہلے جو مسئلہ طے ہو گا وہ یہ ہے کہ مقتدرِ اعلیٰ (sovereign) کون ہے؟ اقتدارِ اعلیٰ کس کا ہے؟ نظام جو بھی بنے گا اس میں سب سے پہلے یہ طے کرنا پڑے گا کہ اختیار کس کا ہے۔ ہر نظام کسی ایک اختیار کے گرد قائم ہوتا ہے۔ جس کی اطاعت کا وہ نظام ہو گا اس کا وہ دین قرار پائے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں

سورۂ یوسف میں ''دینِ المَلِک'' کی ترکیب آئی ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس مصر میں روکنا چاہتے تھے' لیکن اُس وقت بادشاہی نظام کے تحت جو ملکی قانون رائج تھا اُس کی رو سے وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ تو تھے نہیں' البتہ وہ ایک بڑے عہدے پر فائز تھے' اور بادشاہ کا جو نظام مصر میں قائم تھا اس کے مطابق وہ اپنے بھائی کو روک نہیں سکتے تھے۔الفاظ آئے ہیں:

﴿کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ ؕ مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ﴾ (آیت ۷۶)

''اس طرح تدبیر بتا دی ہم نے یوسف کو۔وہ ہرگز نہیں روک سکتا تھا اپنے بھائی کو اُس بادشاہ کے نظام میں.....''

اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے لیے وہ شکل پیدا کر دی جس سے وہ اپنے بھائی کو روک سکیں۔ چنانچہ جہاں بادشاہ مختارِ مطلق ہے' حاکمیت اس بادشاہ کی ہے' پورا نظام اس کے تحت ہے' وہ دین الملک ہے۔

اب غور کیجیے کہ ''دین اللہ'' کیا ہے؟ عجیب بات ہے کہ قرآن مجید میں ''دین الحق'' تین جگہ آیا ہے اور تین ہی جگہ ''دین اللہ'' آیا ہے۔ایک تو سورۃ النصر میں: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ۙ﴿۱﴾ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۙ﴿۲﴾ سورۃ النور میں آیا ہے کہ زانی اور زانیہ کو سزا دو' کوڑے لگاؤ اور دیکھو! اللہ کے اس قانون کے تحت حد جاری کرتے ہوئے اُن کے لیے کوئی رحم کا جذبہ تمہارے اندر پیدا نہ ہونے پائے۔الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَا تَاْخُذْکُمْ بِھِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ﴾ یعنی اللہ کے کیا معنی ہوئے؟ اللہ کا قانون' اللہ کی قائم کردہ اور متعین کردہ حد۔تم اللہ سے بڑھ کر شفیق اور ودود نہیں ہو' تم اللہ سے بڑھ کر رحیم نہیں ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس جرم کی یہ سزا مقرر کی ہے تو اس کے نفاذ کے وقت تمہارے دلوں میں کوئی رحم کا جذبہ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔اور اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ بڑی وحشیانہ سزا ہے' تو گویا وہ یہ سمجھتا ہے کہ مَیں اللہ تبارک و تعالیٰ سے بڑھ کر خلق کے حق میں ودود بھی ہوں' رحیم بھی ہوں' شفیق بھی ہوں۔

سورۂ آل عمران میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗۤ اَسْلَمَ مَنْ

فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا﴾ (آیت ۸۳) ''کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں' حالانکہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے وہ اُسی کی اطاعت کر رہا ہے؟'' چنانچہ دین اللہ اور دین الحق کو اچھی طرح ذہن میں متعین کر لیں کہ وہ نظامِ زندگی جو اطاعتِ خداوندی کے اصول پر قائم ہو۔ اس نظام میں مطاعِ مطلق انسان نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اس میں انسان' انسان کا حاکم نہیں ہے' نہ انسان خود اپنا حاکم ہے۔

ابھی تک انسان کی سوچ جتنی بلند گئی ہے اس کے پیشِ نظر آزادی کا تصور یہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کا اور کوئی قوم دوسری قوم کی حاکم نہ ہو۔ لیکن اپنی حاکمیت کا تصور تو گویا انسانی سوچ کی معراج ہے۔ ہماری اجتماعی سوچ کا معیار یہی جمہوریت ہے۔ وہ تو گویا اس دور کی سب سے اعلیٰ قدر ہے جسے عوامی حاکمیت (popular sovereignty) کا نام دیا جاتا ہے۔ قرآن اس کی بھی نفی کرتا ہے۔ قرآن میں حاکمیت کا اصول دوٹوک الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے: ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ (یوسف: ۶۷) بقول علامہ اقبال: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی' باقی بتانِ آزری!

ایک قوم خود اپنے اوپر حکومت کی دعوے دار ہو تو یہ بھی اتنا ہی بڑا شرک ہے جتنا یہ کہ کوئی اور شخص کسی پر حاکمیت کا دعوے دار ہو کر آ جائے۔ ان میں نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ ''دین اللہ'' یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی بنیاد پر پورا نظامِ زندگی قائم ہو جائے۔ اس کو قرآن اس طرح بھی تعبیر کرتا ہے: ﴿وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ﴾ (الانفال: ۳۹) ''اور ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے''۔ یہ الفاظ قرآن حکیم میں دو جگہ آئے ہیں' سورۃ البقرۃ میں ''کُلُّہٗ'' کا لفظ نہیں ہے۔ ترتیب نزولی میں سورۃ البقرۃ کے فوراً بعد سورۃ الانفال آتی ہے' اگرچہ ترتیبِ مصحف میں خاصا فاصلہ ہے۔ ''دین کُل کا کُل اللہ کا ہو جائے'' کا مفہوم یہ ہے کہ نظامِ اطاعت میں حصے بخرے نہ رہیں کہ زندگی کا

اتنا حصہ اللہ کی اطاعت میں، اتنا اپنی مرضی سے، اتنا زمانے کے چلن کے مطابق اور اتنا بازار کے رواج کے مطابق بسر ہوگا۔ دین کے اس طرح حصے بخرے کر لینا سب سے بڑا شرک ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ پورے کا پورا دین اللہ کا ہونا چاہیے!

اس لفظ دین پر ایک اور اعتبار سے بھی غور کیجیے کہ پورے قرآن مجید میں اور پورے ذخیرۂ احادیث میں مذہب کا لفظ اس معنی میں نہیں آیا جس معنیٰ میں ہم بولتے ہیں۔ قرآن مجید میں لفظ مذہب سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ہماری گفتگو میں عام طور پر پوچھا جاتا ہے: آپ کا مذہب کیا ہے؟ اور جواب میں ''اسلام'' کہہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ بلکہ صحیح تر الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ اسلام صرف مذہب نہیں بلکہ ایک کامل دین ہے۔ مذہب ایک جزو ہے جو انسانی زندگی کے صرف ایک گوشے سے بحث کرتا ہے۔ اس میں کچھ اعتقادات (dogmas)، کچھ مراسم عبودیت (rituals) اور کچھ سماجی رسومات (social customs) ہیں۔ انتہائی سیکولر ذہن بھی مذہب کی نفی نہیں کرتا، لیکن سیکولرزم کی رو سے اجتماعی زندگی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ مسلمان ہیں، ہندو ہیں، سکھ ہیں یا عیسائی ہیں، اپنے اپنے عقیدے رکھیے، ہر شخص اپنی اپنی پوجا پاٹ جس طور سے چاہے کرے، کچھ پرسنل لاء بھی اپنی حد تک کر لیجیے، لیکن قانون ملکی (Law of the Land) کا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہوگا، نہ اسلام سے، نہ عیسائیت سے، نہ ہندومت سے، نہ بدھ مت سے، کسی سے نہیں۔ وہ تو خالص لوگوں کی آزادانہ مرضی پر عوامی حاکمیت کے تصور کی بنیاد پر طے ہوگا کہ قانون ملکی کیا ہے۔ چنانچہ سیکولرزم کے معنی مذہب کی نفی نہیں ہیں، وہ تو مذہب کا اثبات کرتا ہے، البتہ دین کی نفی کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر ہندوستان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہمارے ہاں پوری مذہبی آزادی ہے۔ جبکہ اسلام مذہب نہیں ہے، اسلام دین ہے۔ اور دین کے بارے میں یہ بات جان لیجیے کہ جس طرح دو تلواریں ایک نیام میں نہیں سما سکتیں اسی طرح ایک ملک میں، ایک جگہ پر، ایک خطۂ ارضی پر دو نظام بیک وقت قائم نہیں ہو سکتے۔ البتہ مذہب دس بھی رہ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ہو سکتا ہے بیسیوں مذاہب ہوں، لیکن نظام ایک ہے اور وہ سیکولرزم

ہے۔تو جان لیجیے کہ اسلام دین ہے‘ محض مذہب نہیں ہے۔

آنحضور ﷺ کا فرضِ منصبی

یہ ساری وضاحت ذہن میں رکھتے ہوئے آیت کا اگلا ٹکڑا ملاحظہ کیجیے: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تاکہ اس کو غالب کر دے پورے کے پورے دین پر۔محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو جو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا‘ ان میں سے پہلی چیز کا تقاضا ہے ابلاغ وتبلیغ‘ کہ قرآن پہنچا دیجیے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ (المائدۃ:۶۷) ’’اے رسول! جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اُسے پہنچا دیجیے۔اگر پہنچانے میں کوئی کمی ہوگئی (بفرضِ محال) تو یہ فریضۂ رسالت میں کوتاہی شمار ہوگی!‘‘ ’’الہدیٰ‘‘ کا ابلاغ وتبلیغ آپ کے فریضۂ رسالت کا تقاضا تھا‘ خواہ لوگوں کو پسند ہو یا ناپسند۔مشرکین کا کہنا تھا کہ یہ قرآن بہت سخت (rigid) ہے‘ اس میں آپ ذرا لچک پیدا کیجیے۔سورۂ یونس (آیت ۱۵) میں ان کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ﴾ ’’(اے محمدؐ!) کوئی اور قرآن اس کے سوا لے آیئے یا اس کو بدل دیجیے۔‘‘ آخر کچھ لے دے کر بات بنے گی۔آپ چاہیں کہ کُل کی کُل بات منوا لیں‘ یہ نہیں ہوسکتا۔ہم مصالحت کے خواہش مند ہیں‘ لڑائی نہیں چاہتے۔لیکن اس میں کچھ ترمیم کیجیے‘ اس کو بدل دیجیے یا کوئی اور قرآن لے آیئے۔جواب دلوایا گیا: ﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗيِٕ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ ’’(اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے میرے لیے یہ قطعاً ممکن نہیں ہے کہ میں اپنی مرضی سے اس میں کوئی تغیر وتبدل کر دوں‘ میں تو خود پابند ہوں اُس کا جو مجھ پر وحی کیا جا رہا ہے‘‘۔تو الہدیٰ کے سلسلے میں مکی سورتوں میں یہ مضمون بار بار آیا ہے کہ قرآن کو پہنچایئے‘ اِس کی تبلیغ کیجیے‘ اِس کی اشاعت کیجیے‘ اس کی تذکیر کیجیے‘ اس سے تبشیر کیجیے‘ اس سے انذار کیجیے۔نبی اکرم ﷺ الہدیٰ دے کر بھیجے گئے تاکہ اس کو پہنچا دیں جیسا کہ اس کو پہنچانے کا حق ہے اور دین حق دے کر بھیجے گئے‘ تاکہ اس کو غالب کریں پورے کے پورے دین پر۔یہ نظام قائم ہونے کے لیے آیا ہے اور یہ نظام حجت اُسی وقت ہوگا

جب اس کو قائم کر کے دکھا دیا جائے گا۔

نوعِ انسانی نے عقلی بلوغ کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور کا سفر بھی طے کیا ہے۔ قبائلی زندگی کے بعد شہری ریاستیں اور پھر بڑی عظیم سلطنتیں اور مملکتیں وجود میں آئیں۔ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ایسے وقت میں ہوئی جب اُس دور کا آغاز ہو رہا تھا کہ انسانی زندگی پر اجتماعیت کی گرفت ہمہ گیر ہو جانے والی تھی۔ آج اجتماعیت کی ہمہ گیر گرفت کا اندازہ اس سادہ سی مثال سے کیجیے کہ آپ کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے' اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق دی ہے کہ آپ مسلمان جینا اور مرنا چاہتے ہیں' آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنی اولاد کو بھی اسی نقطۂ نظر پر پروان چڑھائیں' لیکن کیا کریں' بے بس ہیں! ایک پورا تعلیمی نظام ہے' جس کے تحت تعلیمی نصاب متعین ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ایکسپرٹ بیٹھے ہوئے ہیں جو تعلیمی پالیسیاں مرتب کرتے ہیں' نصاب کے بارے میں بہت اعلیٰ سطح پر فیصلے ہوتے ہیں۔ آپ کیا کریں گے' آپ مجبور ہیں کہ اپنے بچے کو اس نظامِ تعلیم کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد آپ کی مرضی کو کوئی دخل نہیں' آپ کی پسند ناپسند کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ آپ دیکھتے رہیے اور آپ کی نگاہوں کے سامنے آپ کے بچے کے اندر الحاد اور مادّہ پرستی سرایت کرتی رہے گی۔ بقول اقبال: ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الّا اللہ؟

آپ کے لیے سوائے ایک گھٹن کے' سوائے بے چینی کے' سوائے ایک کوفت کے کوئی چارہ نہیں' آپ کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ صرف ایک راستہ ہے اُس شخص کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ توفیق دے دے اور وہ اپنی منزل متعین کر لے کہ دنیا سرے سے مقصود نہیں۔ لیکن یہ انتہائی فیصلہ کرنے کی ہر ایک شخص میں ہمت نہیں ہے' یہ تو ہزار میں سے ایک کرے گا بلکہ لاکھ میں سے ایک کرے گا۔ وہ آخری فیصلہ یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم سے بالکل کٹ جائیں۔

یہی وہ بات تھی جس پر انگریز کی آمد کے بعد ہمارے ہاں اختلاف ہوا ہے۔ ایک

رائے یہ تھی کہ انگریزی پڑھو‘ ورنہ دنیا میں پیچھے رہ جاؤ گے۔ وہ رائے بھی خلوص پر مبنی تھی۔ دوسری رائے تھی کہ زمانے سے کٹ جائیں تو کوئی پرواہ نہیں‘ دقیانوسی قرار پا جائیں تو کوئی پرواہ نہیں‘ زمانے کا ساتھ نہ دے سکیں تو کوئی پرواہ نہیں‘ لیکن اس جدید نظامِ تعلیم کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے۔ اب دونوں نظامہائے تعلیم کی اپنی خوبیاں اور merits بھی ہیں اور دونوں کی کمزوریاں بھی ہیں‘ لیکن پوری قوم کا دھارا اُدھر نکل گیا جدھر روٹی کا ٹکڑا لٹکا ہوا تھا۔ ذہنوں پر یہی سوچ مسلط ہوگئی کہ لڑکا میٹرک پاس کر لے گا تو کلرک ہو جائے گا‘ بی اے‘ ایم اے کر لے گا تو اور اچھی ملازمت مل جائے گی۔ وکیل بن جائے گا یا ڈاکٹری کر لے گا تو اُس کا دنیوی مستقبل روشن ہو جائے گا—— اور اگر دینی تعلیم حاصل کرے گا تو کیا کرے گا؟ مسجد کی امامت! اور مسجد کی امامت اب تو کچھ بہتر پیشہ بن گیا ہے‘ اب تو ائمہ کے بھی گریڈ معین ہیں اور باقاعدہ شرائط ملازمت طے ہوتی ہیں۔ ایک دَور وہ تھا جب کہ مسجد کے امام کی گزراوقات محلے کی روٹیوں پر ہوتی تھی۔

اجتماعی نظام کی اپنی پیچیدگیاں اور اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ انفرادی زندگی کی اتنی پیچیدگیاں نہیں ہیں جتنی اس نظامِ اجتماعی کی ہیں۔ فرد کو ذرا سی اہمیت دیجیے تو اجتماعیت متاثر ہوتی ہے۔ اجتماعی مصلحتوں کا زیادہ لحاظ کیجیے تو انفرادی آزادی اور حریت پامال ہوتی ہے۔ سرمائے کی تھوڑی سی ہمت افزائی کیجیے تو مزدور ظلم کی چکی میں پسنے لگتا ہے اور مزدور کی تھوڑی سی پشت پناہی کیجیے تو سرمایہ بدک جاتا ہے‘ وہ آگے نہیں بڑھتا‘ سرمایہ کاری نہیں رہتی۔ اسی طرح کا معاملہ مرد و زن کے حقوق و فرائض کا ہے۔ تو نقطۂ عدل کہاں ہے؟ مرد کو قوّامیت بھی دی جائے اور عورت کو حیثیت بھی ملے‘ یہ توازن صرف اللہ کے دیے ہوئے دین میں مکمل طور پر ممکن ہے‘ اور کہیں نہیں۔ ذاتی ملکیت بھی ہو لیکن اونچ نیچ اتنی نہ پیدا ہو سکے جتنی کسی سرمایہ دارانہ نظام میں ہوتی ہے‘ یہ اعتدال سوائے دین حق کے اور کہیں نہیں مل سکتا۔ آزادی بھی ہو‘ حریت بھی ہو‘ تنقید کی آزادی بھی ہو‘ کہ ایک درویش کھڑا ہو کر عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کہے کہ: ’’لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ!‘‘ ایک بڑھیا کھڑی ہو جائے اور چیلنج کر دے کہ یہ آپ نے کیا آرڈیننس نافذ کر دیا ہے ہمارے مہر کے

بارے میں؟ جس کی کوئی حد اللہ نے مقرر کی نہ اس کے رسولؐ نے‘ اے عمرؓ! تم کون ہوتے ہو اس پر حدود قائم کرنے والے؟ اور عمرؓ یہ کہے کہ آج ایک بڑھیا نے عمرؓ کو دین سکھایا ہے۔ آزادی کا یہ عالم ہو! ساتھ ہی وہ مساوات بھی ہو کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المقدس کا سفر کر رہے ہوں اور غلام کے ساتھ اونٹ پر سوار ہونے کی باری مقرر کر رکھی ہو۔ اور یہ سفر بھی سرکاری تھا‘ کیونکہ آپ بیت المقدس کا چارج لینے جا رہے تھے‘ کوئی ذاتی سفر نہیں تھا۔ اس سفر میں کوئی طائفہ‘ کوئی مصاحبین‘ کوئی خدم و حشم نہیں تھے‘ بس ایک اونٹ اور ایک غلام آپ کے ہمراہ تھا۔ ایک منزل خلیفۂ وقت سوار ہوتا اور غلام نکیل پکڑ کر آگے آگے چلتا۔ اگلی منزل اس شان سے طے ہوتی کہ غلام اونٹ پر سوار ہوتا اور خلیفۂ وقت نکیل تھام کر آگے آگے چلتا۔ مساوات کا یہ نقشہ چشمِ عالم دوبارہ نہیں دیکھ سکی۔ یہاں تو یہ صورت حال ہے کہ مساوات لائیے تو آزادی ختم۔ یہ دین حق ہی ہے جو ان تمام پہلوؤں کے مابین ایک توازن پیدا کرتا ہے۔

ذرا سوچئے تو! اگر کوئی شخص صرف نظری طور پر کہے کہ ایسا ممکن ہے کہ مرد قوّام بھی ہو اور عورت پھر بھی جوتی کی نوک نہ بنے‘ اس کے حقوق ہوں‘ اُس کا مرتبہ اور حیثیت ہو‘ اس کو پوری ایک شخصیت دی جائے‘ عوام کو آزادی بھی حاصل ہو اور مساوات بھی ہو‘ ان دونوں چیزوں کو بیک وقت جمع کیا جائے‘ تو آپ فوراً کہیں گے کہ یہ محض ایک خیالی جنت (Utopia) کا نقشہ ہے‘ یہ ہونے والی بات نہیں۔ جب تک اس نظام کو قائم کر کے اس کو چلا کر نہ دکھا دیا جائے کوئی نظری طور پر اس کا یقین نہیں کرے گا۔ چنانچہ یہ فرض منصبی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا ’’لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ‘‘ کے بارے میں۔ آپ ﷺ کو کتاب دی گئی تو اس کا تقاضا تو پورا ہو گیا کہ تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ اس کے ساتھ جو دین حق دیا گیا‘ آپؐ کا فرضِ منصبی اس کو نافذ کرنا‘ غالب کرنا‘ قائم کرنا‘ چلا کر دکھانا تھا۔ نوعِ انسانی پر حجت اسی صورت میں قائم ہو سکتی تھی۔ وہ جو بنیادی مقصد تھا بعثتِ انبیاء کا اس کو ذہن میں رکھئے۔ اس دَور کے اعتبار سے کہ جس میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو رہی تھی اتمامِ حجت صرف اس طریقے پر ہو سکتا تھا کہ صرف انفرادی ہدایات نہ ہوں‘ صرف اخلاقی

تعلیمات نہ ہوں‘ صرف نظری طور پر کوئی چیز پیش نہ کر دی جائے۔ ایک مکمل نظامِ زندگی دیا جائے اور اسے عملاً قائم کر کے دکھا دیا جائے‘ تب حجت قائم ہو گی نوعِ انسانی پر۔ یہ اتمامِ حجت محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت ہے۔

محض وعظ و نصیحت میں اور اس بات میں کہ آپ کسی غلط نظام کو بیخ و بُن سے اکھیڑ کر صحیح نظام کو قائم کر رہے ہیں بڑا فرق ہے ع :’’زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است!‘‘ آپ وعظ کہیے‘ نصیحت کیجیے۔ کہیں ایسا بھی ہو گا کہ آپ کا استہزاء اور مذاق اڑایا جائے‘ کہیں گلے میں ہار بھی ڈالے جائیں گے‘ آؤ بھگت بھی ہو گی‘ دعوتیں بھی ہوں گی‘ لوگ قدموں میں آنکھیں بچھائیں گے۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ لوگو! سیدھے ہو جاؤ‘ ظلم کو ختم کرو‘ عدل قائم کرو‘ سب اللہ کے بندے بن جاؤ‘ کوئی کسی کا آقا نہیں۔ ع :’’تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!‘‘ کوئی اونچ نیچ نہیں۔ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا‘ سب اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ! تو لوگوں کی پیشانیاں شکن آلود ہو جائیں گی۔ نظام بدلنے کا یہ داعیہ جہاں بھی آئے گا کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں ہو گا۔ اس نظام سے جن کے مفادات وابستہ ہیں اور نظام کی تبدیلی سے ان مفادات پر زد پڑتی ہے وہ کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ اسی لیے ان دو مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ اس دین کو قائم کرنا‘ غالب کرنا‘ نافذ کرنا آپ کا فرضِ منصبی ہے خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناپسندیدہ ہو۔ دینِ حق کو ناپسند کرنا ایک مشرک کے شرک کا لازمی تقاضا ہے۔ چنانچہ مشرکین تو مخالفت کریں گے‘ قدم قدم پر روڑے اٹکائیں گے‘ راستے میں کانٹے بچھائیں گے‘ سر پر راکھ ڈالیں گے‘ پتھروں کی بارش ہو گی‘ شعب بنی ہاشم راستے میں آئے گی‘ یومِ بدر‘ یومِ اُحد‘ یومِ احزاب اور یومِ حنین آئیں گے۔ لیکن آپ کا کام اس دین کو غالب کرنا‘ نافذ کرنا‘ قائم کرنا ہے۔

سورۃ الشوریٰ (آیت ۱۳) میں پہلے اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾ یعنی ’’اے مسلمانو! جو دین حق تمہیں دیا گیا ہے وہ اس لیے دیا گیا ہے کہ اسے قائم کرو اور اس کے بارے میں متفرق نہ ہو جاؤ!‘‘ اور اس

کے بعد رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا: ﴿فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ ۚ وَاسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ ۚ﴾ (آیت ۱۵) ''(اے نبیؐ!) پس آپ اسی (دین) کی دعوت دیتے رہیے اور اسی پر مضبوطی سے ڈٹے رہیے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور آپ ان کی خواہشات کی پیروی مت کیجیے!'' سورۃ الشوریٰ کی یہ آیات اُس دَور میں نازل ہوئی ہیں جب اہل مکہ ایذا رسانی (persecution) کے تمام حربے آزمانے کے بعد مایوس ہو کر اب مصالحانہ پیشکشیں کر رہے تھے۔ چنانچہ بادشاہت بھی پیش کی گئی' دولت بھی پیش کی گئی' یہ بھی کہا گیا کہ آپ جہاں شادی کرنا چاہیں' اشارہ کر دیجیے۔ یہ پیشکشیں اسی وقت ہوئی ہیں جب انہوں نے دیکھ لیا کہ تشدد ناکام ہو چکا ہے۔ اُس وقت انہیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ جواب دلوایا گیا۔ یعنی مَیں محض واعظ بن کر نہیں آیا ہوں' میں تو اس نظامِ عدل کو قائم کرنے آیا ہوں۔ صرف نصیحت کر دینا اور وعظ کہہ دینا میرا مشن نہیں ہے' اس نظام کو بالفعل قائم کر دینا میرا فرضِ منصبی ہے۔

یہ ہے ختم نبوت اور اتمامِ رسالت کا وہ مقام جس کو نہ اپنے سمجھے نہ غیر سمجھے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تیئس سالہ پوری جدوجہد اسی مقصد کے لیے نظر آتی ہے۔ دورِ جدید کی اصطلاح کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تیئس سالہ جدوجہد ایک عظیم انقلابی جدوجہد تھی۔ آپؐ کے پیش نظر ایک نظام کو جڑ سے اکھیڑ کر دوسرا نظام برپا کرنا تھا۔ اور انقلاب صرف وعظ سے نہیں آیا کرتا' انقلاب کے اپنے تقاضے ہیں۔ اس میں تصادم ہوتا ہے' اس میں کشمکش ہوتی ہے' اس میں قدم قدم آگے بڑھایا جاتا ہے' ایک قوت قدم بہ قدم آگے بڑھتی ہے اور دوسری قوت قدم بہ قدم پسپائی اختیار کرتی ہے۔ یہی انقلابی جدوجہد ہے جو نہ مستشرقین کی سمجھ میں آئی نہ مغربی مصنفین کی سمجھ میں آئی۔ اور ہم نے بھی سیرتِ مطہرہ کو اس کے حوالے سے بالکل نہیں سمجھا۔

نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد کا نقطۂ آغاز دعوت الی اللہ تھا۔ اور آپؐ کی پوری جدوجہد سے انقلاب کا یہ طریق کار اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دعوت کے نتیجے میں جو لوگ قریب آئیں' اس دعوت پر لبیک کہیں' ان کی ایک منظّم جماعت بنا لو' ایک منظّم قوت بنا

لو۔ اپنے پیش نظر انقلاب کی مناسبت سے ان کی تربیت کرو اور پھر اسے معاشرے سے ٹکراؤ۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس قائم نظام کو اکھاڑ کر نظامِ عدل قائم کرو! اس کے کچھ تقاضے ہیں اور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کو اس حوالے سے سمجھنا پڑے گا۔ ''لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّه''، ختمِ نبوت، ختمِ رسالت، اتمامِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کا تقاضا ہے اور حضور ﷺ کی بعثت کا یہ وہ خاص مقصد ہے جو کسی اور رسول کے لیے قرآن مجید میں نہیں آیا۔ یہ صرف محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے لیے آیا ہے اور آپؐ کی تیئیس سالہ جدوجہد کا حاصل ہے۔ ایک طرف ''الْهُدٰى'' پہنچا دی گئی، نظری طور پر بھی، عملی طور پر بھی، اور دوسری طرف وہ دینِ حق عملاً قائم کر دیا گیا۔ وہ کیسے قائم ہوا، اس کے خدوخال کیا ہیں، اس جدوجہد کے نمایاں مقامات و مراحل کیا ہیں؟ اس پر ان شاء اللہ العزیز آئندہ گفتگو ہوگی۔ نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کا ایک اجمالی خاکہ ان شاء اللہ العزیز اگلی نشست میں پیش کیا جائے گا۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

❁❁❁

مسجد اقصیٰ کی تولیت کا حقدار کون؟

قرآن وسنت کی روشنی میں ایک تحقیقی جائزہ

حافظ محمد زبیر ☆

ارضِ مقدس ایک مرتبہ پھر سخت ترین یورش کی زد میں ہے۔ مسلمانوں کے قبلۂ اوّل کو منہدم کرنے کی صیہونی سازشیں اپنے 'حتمی مرحلے' میں داخل ہوتی نظر آتی ہیں۔ ایسے حالات میں زمینی حقائق کے ساتھ ساتھ آسمانی ہدایت کا علم اشد ضروری ہے۔ مسلمانوں کو جذباتی طور پر اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مسجد اقصیٰ ہی ان کا قبلہ اوّل ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس جذباتی ادراک کو علمی آگاہی میں تبدیل کیا جائے۔ یہ ضرورت اس بنا پر کئی چند ہو جاتی ہے کہ بعض اصحابِ علم و دانش اپنے زورِ قلم سے حالات کو ایسے طور سے پیش کرنے کی سعی فرما رہے ہیں کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ قبلۂ اوّل کی تولیت پر شرعاً یہود کا حق ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کہتے ہیں عقل کرائے کی وکیل ہوتی ہے' اس سے جیسی چاہو دلیل حاصل کر لو۔ اسی لیے بڑے سے بڑے ظلم اور عریاں سے عریاں ناحق کے حق میں عقلی اور منطقی دلائل کے انبار لگائے جا سکتے ہیں' اور اگر تحریف شدہ 'اسرائیلیات' سے بھی استفادہ کر لیا جائے تو سونے پر سہاگہ ہے۔

ایسی ہی ایک تحریر ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ تحریر معروف عالم دین مولانا زاہد الراشدی صاحب کے بیٹے اور ماہنامہ 'الشریعہ' کے مدیر جناب محمد عمار خان ناصر صاحب کی ہے۔ عمار صاحب کی اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تولیت کا شرعی حق یہود کو حاصل ہے اگرچہ تکوینی طور پر یہ مسجد سینکڑوں سال سے مسلمانوں کی تولیت میں ہے۔ مسجد اقصیٰ کی تولیت پر یہود کے شرعی حق کی کل دلیل' عمار صاحب کے نزدیک وہ اسرائیلیات ہیں جن کو وہ کتاب مقدس کے بیانات کہتے ہیں۔ ان اسرائیلی روایات سے محترم عمار صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ' قرآن اکیڈمی لاہور

کہ مسجد اقصیٰ یعنی ہیکل سلیمانی کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے زمانے میں جنات سے تعمیر کروایا تھا۔ یہ ہیکل یہودیوں کا قبلہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ ان کا مقام حج ہے۔ یہی ان کی قربان گاہ اور مرکز عبادت ہے' اس کی طرف رخ کر کے وہ نماز ادا کرتے ہیں۔

ہمارے خیال میں یہ نظریہ ہی غلط ہے کہ مسجد اقصیٰ یہودیوں کا قبلہ یا مقامِ حج یا نماز کے لیے ایک سمت ہے۔ قرآن وسنت تو کیا کسی ایک اسرائیلی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ بیت المقدس کو اللہ تعالیٰ نے یہود کا قبلہ مقرر کیا تھا۔ حق بات یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کا قبلہ 'مسجد حرام' رہا ہے۔ تمام انبیاء مسجد حرام کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے ہیں اور یہیں آ کر فریضۂ حج ادا کرتے رہے ہیں۔ شروع شروع میں عارضی طور پر مسجد اقصیٰ کو مسلمانوں کا قبلہ مقرر کیا گیا۔ اس لحاظ سے یہ مسلمانوں کا قبلہ تو ہوا' لیکن یہ مسجد یہود کا قبلہ کبھی بھی نہ رہی۔ مسجد اقصیٰ کو اپنا قبلہ قرار دینا یہودیوں اور عیسائیوں کی اپنے دین میں اختراع ہے۔ مسجد اقصیٰ کی حیثیت مسلمانوں کے ایک بابرکت مقام' مسجد اور قبلہ اوّل کی ہے۔ مسجد اقصیٰ یہودیوں کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے' اس لیے اس کی تولیت کا حق بھی مسلمانوں ہی کو حاصل ہے۔ مسجد اقصیٰ کا مسئلہ چونکہ ایک اصولی مسئلہ ہے اس لیے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس پر اصولی انداز میں بحث ہونی چاہیے۔ عمار صاحب سے اس مسئلے کی تحقیق میں جو بنیادی غلطی ہوئی وہ یہ ہے کہ انہوں نے اسرائیلیات کی روشنی میں قرآن وسنت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔[1] اگر وہ قرآن وسنت کی روشنی میں اسرائیلی روایات کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو ان کے نتائج اس سے بہت مختلف ہوتے جو وہ بیان کر رہے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کی فضیلت

مسجد اقصیٰ کے درج ذیل فضائل قرآن حکیم اور احادیثِ نبویہؐ میں بیان ہوئے ہیں:

(۱) مسجد اقصیٰ بابرکت زمین میں ہے

قرآن میں چار مقامات پر سرزمین شام کو بابرکت زمین کہا گیا ہے۔ نزول قرآن کے

(۱) محترم عمار صاحب نے تحقیق کا یہ انداز واسلوب جناب غامدی صاحب سے سیکھا ہے۔ غامدی صاحب نے اپنی کتاب 'میزان' میں تفصیل سے اپنے اس اصول کو بیان کیا ہے کہ قرآن کو سابقہ صحف سماویہ کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

وقت ملک شام' موجودہ شام سے بہت وسیع تھا۔موجودہ فلسطین بھی اس کا ایک حصہ تھا۔مسجد اقصیٰ شام کی اسی بابرکت سرزمین میں واقع ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا یُسۡتَضۡعَفُوۡنَ مَشَارِقَ الۡاَرۡضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡهَا﴾ (الاعراف:۱۳۷)

''اور ہم نے اس قوم کو جس کو کمزور بنایا گیا تھا' اس سرزمین کے مشرق ومغرب کا وارث بنایا کہ جس سرزمین میں ہم نے برکت رکھ دی ہے''۔

اس آیت مبارکہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دَور میں موجود بنی اسرائیل کی اس عظیم سلطنت کی طرف اشارہ ہے جو اُس زمانے کے شام اور اس کے گردونواح پر مشتمل تھی۔اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَجَّیۡنٰهُ وَلُوۡطًا اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡهَا لِلۡعٰلَمِیۡنَ﴾ (الانبیاء)

''اور ہم اس کو (یعنی حضرت ابراہیمؑ) اور حضرت لوطؑ کو نجات دی ایک ایسی سرزمین کی طرف جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لیے برکت رکھ دی ہے''۔

اس آیت مبارکہ میں وارد شدہ لفظ ''الۡعَالَمِیۡنَ'' سے واضح ہوتا ہے کہ سرزمین فلسطین وشام کی برکات کسی خاص جماعت' قوم یا مذہب کے ماننے والوں کے لیے نہیں ہیں' جیسا کہ یہودیوں کا یہ خیال ہے کہ اس سرزمین کی برکات ان کے لیے مخصوص ہیں' بلکہ اس سرزمین کی برکت تمام اقوام' مذاہب اور جماعتوں کے لیے ہیں۔اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ عَاصِفَةً تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِهٖۤ اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡهَا﴾(الانبیاء:۸۱)

''اور حضرت سلیمانؑ کے لیے ہم نے تیز وتند ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھ دی ہے''۔

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَجَعَلۡنَا بَیۡنَهُمۡ وَبَیۡنَ الۡقُرَی الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡهَا قُرًی ظَاهِرَةً﴾(سبا:۱۸)

''اور ہم نے ان (یعنی قوم سبا) کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت رکھ دی ہے' کچھ نمایاں بستیاں بنائی تھیں''۔

اس آیت مبارکہ کے لفظ ''الۡقُریٰ'' سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ برکت صرف فلسطین کی بستی میں نہیں رکھی گئی بلکہ ان تمام بستیوں میں رکھی گئی ہے جو کہ سرزمین شام پر واقع ہیں۔

۲) مسجد اقصیٰ کے اردگرد کی سرزمین بھی بابرکت ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ﴾(الاسراء: ۱)

''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو ایک رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کہ جس کے اردگرد ہم نے برکت رکھ دی ہے''۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے ساتھ ساتھ اس کے اردگرد کی سرزمین یعنی فلسطین وشام کا علاقہ بھی بابرکت ہے۔

۳) مسجد اقصیٰ ارض مقدسہ میں ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَۃَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ﴾(المائدہ: ۲۱)

''اے میری قوم کے لوگو! داخل ہو جاؤ اس مقدس سرزمین میں جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے''۔

قتادہؒ کے نزدیک ارض مقدسہ سے مراد 'شام' ہے جبکہ مجاہدؒ اور ابن عباسؓ کے ایک قول کے مطابق اس سے کوہ طور اور اس کے اردگرد کا علاقہ مراد ہے۔ اسی طرح سدیؒ اور ابن عباسؓ کے دوسرے قول کے مطابق اس سے مراد 'اریحا' ہے۔ زجاج نے کہا اس سے مراد 'دمشق اور فلسطین' ہے۔ بعض مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ اس سے مراد 'اردن کا علاقہ' ہے۔ امام قرطبیؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ قتادہ کا قول سب کو شامل ہے۔ امام قرطبی کے اس قول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں شام میں فلسطین، دمشق اور اردن کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اسی طرح کوہ طور اور اس کے اردگرد کا علاقہ حتیٰ کہ اریحا کا شہر بھی شام کی بابرکت سرزمین کی حدود میں تھا۔

۴) بیت اللہ کے بعد دوسری مسجد

مسجد اقصیٰ روئے زمین پر بیت اللہ کے بعد دوسری مسجد ہے جس کو عبادت الٰہی کے لیے تعمیر کیا گیا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے:

سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَنْ اَوَّلِ مَسْجِدٍ وُضِعَ فِی الْاَرْضِ، قَالَ:

((الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ)) قُلْتُ: ثُمَّ اَیٌّ؟ قَالَ: ((الْمَسْجِدُ الْاَقْصٰی)) قُلْتُ: كَمْ بَيْنَهُمَا؟ قَالَ: ((اَرْبَعُوْنَ عَامًا))(۱)

''میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ اس روئے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر کی گئی؟ آپؐ نے جواب دیا: ''مسجد حرام''۔ میں نے پھر سوال کیا: اس کے بعد کون سی مسجد تعمیر کی گئی؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''مسجد اقصیٰ''۔ میں نے کہا: ان دونوں کی تعمیر کے دوران کل کتنا وقفہ ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''چالیس سال''۔

۵) مسجد اقصیٰ کی طرف شدّ رحال کی مشروعیت

مسجد اقصیٰ ان تین مساجد میں شامل ہے جن کا تبرک حاصل کرنے کے لیے یا ان میں نماز پڑھنے کے لیے یا ان کی زیارت کے لیے سفر کو مشروع قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِیْ هٰذَا وَمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الْاَقْصٰی)) (۲)

''تین مساجد کے علاوہ کسی جگہ کا قصد کر کے سفر کرنا جائز نہیں ہے: میری اس مسجد کا (یعنی مسجد نبوی کا)، مسجد حرام کا اور مسجد اقصیٰ کا''۔

۶) مسجد اقصیٰ کو انبیاء نے تعمیر کیا

مسجد اقصیٰ ان مساجد میں سے ہے جن کو جلیل القدر انبیاء نے تعمیر کیا۔ طبرانی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

اِنَّ داؤد ابتدأ ببناء البيتِ المقدس ثم اوحى اللّٰه اليه انى لاقضى بناؤه علٰى يد سليمان(۳)

''حضرت داؤدؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کے لیے بنیادیں رکھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں مکمل کرواؤں گا''۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما اللہ کے رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

((اَنَّ سُلَيْمَانَ بْنَ دَاوٗدَ لَمَّا بَنٰى بَيْتَ الْمَقْدِسِ سَاَلَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ خِلَالًا ثَلَاثَةً ... سَاَلَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ حِيْنَ فَرَغَ مِنْ بِنَاءِ الْمَسْجِدِ اَنْ لَّا يَاْتِيَهُ اَحَدٌ لَا يَنْهَزُهُ اِلَّا الصَّلَاةُ فِيْهِ اَنْ يُخْرِجَهُ مِنْ خَطِيْئَتِهٖ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ (۴)

''حضرت سلیمانؑ نے جب بیت المقدس کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کی دعا کی...جب وہ مسجد بنا کر فارغ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ جب بھی کوئی شخص اس مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے آئے تو وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو کر نکلے جیسے کہ اس کی ماں نے اس کو جنا ہو''۔

۷)مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی فضیلت

صحیح حدیث میں مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی بہت زیادہ فضیلت بیان ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی مندرجہ بالا حدیث۔

۸)مسجد اقصیٰ سے احرام باندھ کر حج کرنے کی فضیلت

مسجد اقصیٰ سے حج یا عمرہ کے لیے احرام باندھ کر مسجد حرام کی طرف نکلنے کی بہت زیادہ فضیلت حدیث میں آئی ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

((مَنْ اَهَلَّ بِحَجَّةٍ اَوْ عُمْرَةٍ مِنَ الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی اِلَی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ اَوْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ)) شَکَّ عَبْدُ اللّٰهِ اَیَّتُهُمَا قَالَ(۵)

''جس نے بھی مسجد اقصیٰ سے مسجد حرام تک لیے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھا اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے یا اس کے لیے جنت واجب ہو جائے گی''۔

عبداللہ کو شک گزرا کہ آپؐ نے ان دونوں میں کون سے الفاظ فرمائے ہیں۔

۹)مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی نذر ماننا جائز ہے

فتح مکہ کے موقع پر ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر سوال کیا:

یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلّٰهِ اِنْ فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْکَ مَکَّةَ اَنْ اُصَلِّیَ فِیْ بَیْتِ الْمَقْدِسِ رَکْعَتَیْنِ، قَالَ : ((صَلِّ هَاهُنَا)) ثُمَّ اَعَادَ عَلَیْهِ ، فَقَالَ : ((صَلِّ هَاهُنَا)) ثُمَّ اَعَادَ عَلَیْهِ ، فَقَالَ : ((صَلِّ هَاهُنَا)) ثُمَّ اَعَادَ عَلَیْهِ، فَقَالَ : ((شَاْنُکَ اِذَنْ)) (۶)

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے ہاتھوں مکہ

فتح کروا دیا تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز پڑھوں گا۔ آپؐ نے فرمایا: یہاں ہی پڑھ لے۔ اس نے پھر آپؐ کے سامنے اپنی بات کو دہرایا تو آپؐ نے فرمایا: ''یہیں نماز پڑھ لے۔ اُس نے (تیسری بار) پھر اپنی بات کو دہرایا تو آپؐ نے یہی فرمایا: ''یہیں نماز پڑھ لے۔ اُس نے (چوتھی بار) پھر اپنی بات کو دہرایا تو آپؐ نے فرمایا: ''تب یہ تمہارا معاملہ ہے (یعنی جہاں تو چاہے پڑھ لے' میں نے تو تیری آسانی کی خاطر تجھے یہ مشورہ دیا تھا)''۔

اس کے علاوہ بھی روایات ہیں جن سے مسجد اقصیٰ کی برکت وفضیلت کا اظہار ہوتا ہے' لیکن طوالت کے خوف سے ہم صرف انہی روایات پر اکتفا کرتے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کی تعمیر وتاریخ

محترم عمار صاحب نے اپنے مضمون میں مسجد اقصیٰ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اپنی تحقیق کی کل بنیاد اسرائیلی روایات کو بنایا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کی وہ حدیث جس میں مسجد اقصیٰ کی پہلی تعمیر کا تذکرہ ہے اس کو حاشیہ میں بیان کیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عمار صاحب کی اس نادر تحقیق کے اصل اور فیصلہ کن مصادر کون سے ہیں؟

قرآن وسنت کی روشنی میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر وتاریخ کا تعین کرنے میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کی درج ذیل روایت کو بنیادی مقام حاصل ہے:

''میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ اس روئے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر کی گئی؟ آپؐ نے جواب دیا: ''مسجد حرام''۔ میں نے پھر سوال کیا: اس کے بعد کون سی مسجد تعمیر کی گئی؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''مسجد اقصیٰ''۔ میں نے کہا: ان دونوں کی تعمیر کے دوران کل کتنا وقفہ ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''چالیس سال''۔(۷)

اس روایت سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱) اس زمین پر سب سے پہلی مسجد جو اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کی گئی' مسجد حرام ہے۔

۲) دوسری مسجد جو اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کی گئی' مسجد اقصیٰ ہے۔

۳) ان دونوں مساجد کی تعمیر کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کس دور میں ہوئی؟ اگر بیت اللہ کی تعمیر کا زمانہ متعین ہو جائے تو مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا زمانہ از خود متعین ہو جائے گا۔ کیونکہ صحیح حدیث کے مطابق مسجد اقصیٰ کی تعمیر بیت اللہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد ہوئی۔ بیت اللہ کی تعمیر کے بارے

میں آراء مختلف ہیں، جن میں سے دو آراء ہی دلائل کی روشنی میں قوی ہیں:

ا) ایک رائے یہ ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں ہوئی تھی۔ قرآنی نص سے یہ بات ثابت ہے کہ بیت اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۲۷)

''اور جب حضرت ابراہیمؑ بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور حضرت اسمٰعیل بھی''۔

اگر ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس تعمیر کو بیت اللہ کی پہلی تعمیر مانیں تو مسجد اقصیٰ کے پہلے مؤسس حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں گے۔

ب) دوسری رائے یہ ہے کہ بیت اللہ کی پہلی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں ہوئی۔ اگر اس قول کو صحیح مانیں تو مسجد اقصیٰ کے مؤسس حضرت آدم علیہ السلام قرار پائیں گے۔

ہمارے نزدیک صحیح قول یہی ہے کہ بیت اللہ کی پہلی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آ کر اس کی تجدید کی۔ ہماری اس رائے کی بنیاد درج ذیل دلائل پر ہے:

۱) اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کے لیے نماز کو مشروع قرار دیا تھا جس کے لیے ایک قبلہ کا ہونا ضروری تھا۔ لہٰذا حضرت آدمؑ کے دین میں نماز کا مشروع ہونا اس بات کا متقاضی تھا کہ اس کے لیے حضرت آدم کوئی قبلہ بھی تعمیر کرتے۔

۲) اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر کی تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس بات کا بھی اقرار کیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ماقبل اسلامی شریعتوں میں حج کا کوئی تصور نہ تھا، جو کہ غلط ہے۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے مختلف انبیاء کے ہاں حج کا تصور اس بات کو ملتزم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے ایک قبلے کا وجود مانا جائے۔

۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام جب حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ سلامٌ علیہا کو سرزمین مکہ میں آباد کرنے کے لیے وہاں چھوڑنے گئے تو اُس وقت انہوں نے دُعا مانگی، جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿رَبَّنَا اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾

(ابراھیم:۳۷)

''اے میرے پروردگار! بے شک میں نے اپنی اولاد کو آباد کیا ایک ایسی سرزمین میں جو کہ کھیتی والی نہیں ہے تیرے حرمت والے گھر کے پاس''۔

اس دعا کے الفاظ ''عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے وقت بیت اللہ کی بنیادیں موجود تھیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی تعمیر ہو چکا تھا۔

۴) اس قرآنی موقف کے شواہد بعض ضعیف روایات سے بھی ہمیں ملتے ہیں۔ مثلاً امام بیہقی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

بَعَثَ اللّٰه جبرئيل الى آدم وحواء فأمرهما ببناء الكعبة فبناه آدم ثم أمربالطواف به وقيل له أنت أول الناس و هٰذا اول بيت وضع للناس(۸)

''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کو حضرت آدم وحوا کی طرف بھیجا اور ان کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ حضرت آدم نے بیت اللہ کو تعمیر کیا۔ پھر حضرت آدم کو بیت اللہ کا طواف کرنے کا حکم دیا اور حضرت آدم سے کہا گیا کہ تو پہلا آدمی ہے اور یہ پہلا گھر ہے جو کہ لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے''۔

۵) علامہ ابن حجرؒ نے بھی اسی رائے کو ایک روایت کی بیان پر بھی ترجیح دی ہے۔ ابن حجر لکھتے ہیں:

ويؤيد قول من قال :أن آدم هو الذى أسس كلا من المسجدين فذكر ابن هشام فى كتاب التيجان أن آدم لما بنى الكعبة أمره اللّٰه بالسير الى بيت المقدس و أن يبنيه فبناه و نسک فيه و بناء آدم للبيت مشهور و قد تقدم قريبا حديث عبد اللّٰه بن عمرو أن البيت رفع زمن الطوفان حتى بوأه اللّٰه لابراهيم(۹)

''اور ان لوگوں کے قول کی تائید جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت آدم نے مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں کو تعمیر کیا' اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو ابن ہشام نے کتاب التیجان میں نقل کیا ہے کہ حضرت آدمؑ نے جب بیت اللہ کو تعمیر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ وہ بیت المقدس کی طرف جائیں اور اس کی بنیاد رکھیں' تو انہوں نے جا کر اس کو تعمیر کیا اور بیت اللہ کی جو تعمیر حضرت آدمؑ کے ہاتھوں ہوئی وہ معروف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ بیت اللہ کو طوفان نوح کے دوران اٹھا لیا گیا تھا بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ٹھکانہ بنایا''۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی طرح مسجد اقصیٰ کی بھی کئی دفعہ تعمیر ہوئی۔طبرانی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

ان داؤد ابتدأ ببناء البیت المقدس ثم اوحی اللّٰہ الیہ انی لأقضی بناؤہ علی ید سلیمان (۱۰)

''حضرت داؤدؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کے لیے بنیادیں رکھیں' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں مکمل کرواؤں گا''۔

اسی طرح نسائی کی ایک روایت ہے:

''جب حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کی دعا کی.....''(۱۱)

ان روایات میں مسجد اقصیٰ کی پہلی تعمیر کے علاوہ' جو حضرت آدمؑ نے کی تھی' ایک دوسری تعمیر کا بھی تذکرہ ہے۔کیونکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سلیمانؑ کے درمیان زمانی وقفہ ایک تاریخی روایت کے مطابق تین ہزار سال جبکہ دوسری روایت کے مطابق ڈیڑھ ہزار سال ہے۔

ج)ایک تیسری رائے محترم عمار صاحب نے حدیث ابوذرؓ کے حوالے سے اپنے مضمون کے حاشیے میں بیان کی ہے۔عمار صاحب لکھتے ہیں:

''اس روایت پر یہ اشکال ہے کہ تاریخ کے مسلمات کی رو سے مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی اور ان کے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے مابین' جو مسجد حرام کے معمار تھے' کئی صدیوں کا فاصلہ ہے' جبکہ روایت میں دونوں مسجدوں کی تعمیر کے درمیان صرف چالیس سال کا فاصلہ بتایا گیا ہے۔علمائے حدیث کے نزدیک اس کی توجیہہ یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کے مقام کی تعیین تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرما دی تھی اور مذکورہ روایت میں اسی کا ذکر ہے' جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے صدیوں بعد اسی جگہ پر ہیکل سلیمانی تعمیر کیا۔اس لحاظ سے ان کی حیثیت ہیکل کے اولین بانی اور مؤسس کی نہیں' بلکہ تجدید کنندہ کی ہے''۔(۱۲)

محترم عمار صاحب نے اس رائے کی نسبت علمائے حدیث کی طرف کی ہے حالانکہ علمائے حدیث میں سے کسی ایک کی بھی یہ رائے نہیں ہے جو عمار صاحب بیان کر رہے ہیں۔یہ عمار صاحب کی اپنی رائے ہے جس کی نسبت انہوں نے علمائے محدثین کی طرف کر دی ہے اور جن کتابوں کے وہ حوالے دے رہے ہیں ان میں یہ بات اس طرح موجود نہیں ہے جس طرح

وہ اس کو بیان کر رہے ہیں۔

عمار صاحب سے پہلی غلطی تو یہ ہوئی کہ انہوں نے اس رائے کی نسبت علمائے محدثین کی طرف کر دی حالانکہ یہ رائے صرف ابن قیم اور ابن کثیر کی ہے' کیا دو پر جمع کا اطلاق ہوتا ہے؟

دوسری غلطی عمار صاحب نے یہ کی کہ جب دیکھا کہ مسئلہ حدیث کا ہے تو ابن قیم اور ابن کثیر کو علمائے محدثین بنا کر پیش کر دیا حالانکہ مقدم الذکر کا اصل میدان عقیدہ وفقہ ہے اور مؤخر الذکر کا تفسیر و تاریخ' ان میں سے کوئی ایک بھی علماء میں بطور محدث اس طرح معروف نہیں ہے جس طرح مؤلفین صحاح ستہ یا ان کے اساتذہ وغیرہ۔

عمار صاحب سے تیسری غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ابن قیم اور ابن کثیر کی رائے کو بھی ان حضرات کے اپنے الفاظ میں پیش نہیں کیا۔ ابن قیم نے اپنی رائے بیان کرتے ہوئے جو الفاظ بیان کیے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

و الذی أسسه هو یعقوب بن اسحاق (۱۳)

جبکہ ابن کثیر نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں:

وان أول من جعله مسجدًا اسرائیل علیه السلام (۱٤)

جبکہ محترم عمار صاحب نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ یہ ہیں:

''علمائے حدیث کے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ مسجد اقصی کے مقام کی تعیین تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمادی تھی''۔ (۱۵)

محترم عمار صاحب نے امام ابن قیم کے لفظ ''أَسَّس'' اور امام ابن کثیر کے لفظ ''جَعَلَ'' کا ترجمہ ''تعین کرنا'' کیا ہے۔ اس کو ان جلیل القدر علماء کی آراء میں تحریف نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟

چوتھی غلطی عمار صاحب سے یہ ہوئی کہ انہوں نے حدیث میں موجود الفاظ ''وُضِعَ'' کو نظر انداز کر دیا جس کا معنی لغت میں ''تعین کرنا'' نہیں ہوتا۔ امام ابن قیم اور امام ابن کثیر جیسے علماء کے یہ شایان شان نہیں ہے کہ ان کی طرف اس بات کی نسبت کی جائے کہ انہوں نے حدیث میں وارد شدہ الفاظ ''وُضِعَ'' سے مراد بیت المقدس کی ''تعیین'' لی ہے۔

عمار صاحب کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بیت المقدس کی تعمیر پہلی دفعہ حضرت سلیمانؑ نے ہی کی اور وہ یہ عزم کیے ہوئے ہیں کہ کسی طرح بیت المقدس کی تعمیر کے

بارے میں واردشدہ اسرائیلی روایات، جن پر انہوں نے اپنے موقف کی بنیاد رکھی ہے، کو صحیح ثابت کر دیا جائے، چاہے انہیں اس کے لیے صحیح احادیث کی من گھڑت تأویل اور علمائے سلف کی آراء میں تحریف ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ ''تحریف'' کا لفظ شاید عمار صاحب کو ناگوار گزرے لیکن انہوں نے اپنے مضمون میں مسجد اقصیٰ کے حوالے سے علماء کے عمومی موقف کے بارے میں جس قدر سخت لب ولہجہ اور اسلوب اختیار کیا ہے اس کی بھی ایک جھلک ذرا قارئین ملاحظہ فرمالیں۔ عمار صاحب لکھتے ہیں:

''یہ نکتہ اب اہل علم کے لیے ایک کھلے سوال کی حیثیت رکھتا ہے کہ عالم عرب کا یہ کم وبیش اجماعی موقف، جس کو متعدد اکابر علمائے دین ومفتیان شرع متین کی تائید ونصرت حاصل ہے اور جس کو مسلم اور عرب میڈیا تسلسل کے ساتھ دہرا رہا ہے، کتمانِ حق اور تکذیب آیات اللہ کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں؟'' (۱۶)

عمار صاحب اپنے ایک اجتہادی موقف پر اس قدر مصر ہیں کہ علماء کے کم وبیش اجماع کو کتمانِ حق اور تکذیب آیات اللہ سے تعبیر کر رہے ہیں۔ عمار صاحب مذکورہ بالا عبارت میں جو سوال اہل علم سے کر رہے ہیں وہی سوال اگر وہ اپنے آپ سے بھی کر لیتے تو ان کو اس کا جواب مل جاتا۔ عمار صاحب مولانا وحید الدین خان صاحب پر تنقید کرتے ہوئے ماہنامہ 'الشریعہ' میں لکھتے ہیں:

''مولانا کے زاویہ نگاہ سے اصولی طور پر اتفاق رکھنے والے اہل فکر کا ایک حلقہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مخالف فکری زاویوں اور شخصیات پر تنقید کے لیے ان کا اختیار کردہ لب ولہجہ اور اسلوب 'رأیی صواب یحتمل الخطأ ورأیهم خطأ یحتمل الصواب' کے ذہنی رویے کے بجائے حتمیت کی عکاسی کرتا ہے اور وہ اپنے زاویہ نگاہ کو ایک نقطہ نظر سمجھنے کے بجائے 'واحد درست طرز فکر' قرار دینے میں حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں''۔ (۱۷)

ایک اور جگہ ماہنامہ اشراق، جنوری ۲۰۰۷، ص ۱۷ پر محترم عمار صاحب لکھتے ہیں:

''اگر علمی مباحث میں طعن وتشنیع اور تفسیق وتضلیل کا رویہ در آئے تو تنقید فکر ونظر کی آبیاری کرنے کی بجائے محض 'بَغْیًا بَیْنَهُمْ' کا ایک نمونہ بن کر رہ جاتی ہے''۔

ہم عمار صاحب سے سوال کرتے ہیں کیا یہ اصولِ تنقید صرف ان کے لیے ہیں جو آپ یا آپ کی طرح کے آزاد خیال مفکرین کی آراء پر تنقید کرنا چاہیں یا آپ کو بھی علماء کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنے قلم کو لگام دینی چاہیے؟

بہر حال خلاصہ کلام یہ کہ مذکورہ بالا بحث سے درج ذیل نتائج ثابت ہوتے ہیں:

۱) مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں کے مؤسس حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔
۲) ظاہر نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد حرام کی دوسری تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی، جبکہ مسجد اقصیٰ کی دوسری تعمیر کی بنیاد حضرت داؤد علیہ السلام نے رکھی اور مکمل حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں ہوئی۔ اس عرصے کے درمیان میں کسی اور تعمیر کا تذکرہ صحیح نصوص میں نہیں ملتا۔

یہ تو مسجد اقصیٰ کے حوالے سے ہماری کچھ ضمناً گفتگو تھی جس کا مقصد عمار صاحب کے مضمون سے پیدا شدہ ایک غلط فہمی کا ازالہ تھا۔ اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں:

مسجد اقصیٰ کی تولیت مسلمانوں کا حق ہے

مسجد اقصیٰ کی تولیت مسلمانوں کا شرعی حق ہے، جس کے درج ذیل دلائل ہیں:

۱) مسجد اقصیٰ کی تعمیر مسلمان انبیاءؑ نے کی:

مسجد اقصیٰ کی تعمیر مسلمان انبیاء کے ہاتھوں ہوئی۔ سب سے پہلے اسے حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا جو مسلمان تھے۔ اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کی بنیاد رکھی، پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو مکمل کیا۔ اس لیے اس مسجد پر اسی قوم کا حق ہے جو مسلمان ہو۔ جب تک عیسائی اور یہودی مسلمان تھے اُس وقت تک اس عبادت گاہ پر ان کا حق قائم تھا لیکن اللہ کے رسول ﷺ کی آمد کے بعد جو بھی یہودی اور عیسائی آپ پر ایمان نہیں لاتا وہ کافر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا﴾ (النساء: ۱۵۱)

''بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بعض رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ اس کے درمیان کوئی راستہ تلاش کرنا چاہتے ہیں، یہی لوگ پکے کافر ہیں''۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو بھی یہودی اور عیسائی اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان نہ لے کر

آئے وہ پکا کافر ہے۔اور کافر مسلمانوں کی بنائی ہوئی عبادت گاہ کا کیسے وارث ہوسکتا ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی مسجد بنائی اور اس کی بعد میں آنے والی نسلوں میں سے کوئی یہودی ہو گیا تو کیا اب اس مسجد کو یہودیوں کی عبادت گاہ بنا کر اس یہودی کے کنٹرول میں دے دیا جائے گا؟ مسجد اقصیٰ پر اُس وقت یہودیوں کا حق تھا جب تک وہ مسلمان تھے' آج بھی اگر وہ اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان لے آتے ہیں تو ہمارا ان سے کوئی جھگڑا نہیں ہے' ہم مسجد اقصیٰ کی تولیت ان کے سپرد کر دیں گے۔لیکن اگر وہ اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے بھی پھر جائیں تو کس بنیاد پر ان کو مسجد اقصیٰ کا وارث قرار دیا جائے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (آل عمران)

''حضرت ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی' لیکن وہ ایک یکسو مسلمان تھے' اور مشرکین میں سے نہ تھے۔بے شک حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ولایت رکھنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس (کی قوم میں سے اس) کی پیروی کی اور یہ نبی ﷺ ہیں اور وہ لوگ جو (اس نبی پر) ایمان لائے۔اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا والی ہے''۔

حضرت ابراہیمؑ کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے تمام انبیاء کے اصل ورثاء اور جانشین مسلمان ہیں نہ کہ یہود و نصاریٰ۔اگر حضرت سلیمانؑ نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی بھی تھی تو اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ اب یہ مسجد کافروں کی عبادت گاہ بن گئی ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دَور میں موجود بنی اسرائیل مسلمان تھے لہٰذا اس بنیاد پر اس مسجد کے وارث بھی تھے۔اللہ کے رسول ﷺ سے بغض اور کینہ رکھنے کے ساتھ ساتھ آپؐ پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے آج کل کے یہودیوں کے کافر ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے' بلکہ ان کے کفر پر امت کا اجماع ہے' لہٰذا مسجد اقصیٰ جو کہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے' اس پر ایک کافر قوم کا حق کیسے جتایا جا سکتا ہے؟

بفرضِ محال اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ مسجد اقصیٰ پر یہود کا حق ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ اہل کتاب میں سے جو بھی محمد ﷺ کی رسالت کا انکاری ہو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور

تورات کا بھی انکاری ہے' کیونکہ دونوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی آمد اور ان کی علامات کی خبر دی ہے۔ لہٰذا ایسا یہودی جو اللہ کے رسول ﷺ کو نہ ماننے کے ساتھ تورات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات بھی ماننے سے انکار کر دے وہ تو اپنے دین' اپنے نبی اور اپنی کتاب کا بھی انکاری ہے اور ایسا یہودی مسجد اقصیٰ کا وارث کیسے ہو سکتا ہے؟

۲) تمام انبیاء کا قبلہ بیت اللہ تھا

تمام انبیاء' بشول انبیائے بنی اسرائیل' کا قبلہ بیت اللہ تھا۔ اس لیے یہودیوں کا قبلہ بھی' از روئے دین اسلام' شروع سے ہی' بیت اللہ ہے۔ تمام انبیاء بیت اللہ کی طرف ہی رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اور اسی کا حج کرتے تھے۔ یہودیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ''ہیکل سلیمانی'' ان کا قبلہ ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ایک ہی وقت میں دو متوازی قبلوں کا وجود' خود مقصد قبلہ کے خلاف ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بیت اللہ کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حج کی آواز لگائی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴿۲۷﴾﴾ (الحج)

''اور (اے ابراہیمؑ) لوگوں میں حج کا اعلان عام کرو۔ وہ تیرے پاس آئیں گے پیدل اور دبلے اونٹوں پر اور ہر دُور کے راستے سے آئیں گے''۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ بیت اللہ کے بالمقابل فلسطین میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک علیحدہ قبلہ بنایا تو درج ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱) کیا قرآن کی آیت میں موجود الفاظ 'النَّاس' میں بنو اسرائیل داخل نہیں ہیں؟

۲) اگر بنو اسرائیل کے آباء و اَجداد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کا قبلہ بیت اللہ ہی تھا تو ان کی بعد میں آنے والی نسلوں کا قبلہ تبدیل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس کی کیا دلیل ہے کہ باپ (یعقوبؑ) کا قبلہ بیت اللہ تھا اور بیٹوں (بنو اسرائیل) کا قبلہ بیت المقدس تھا؟ کیا بنو اسرائیل اپنے باپ حضرت یعقوبؑ کے دین پر نہ تھے؟

۳) کیا تمام انبیاء کا دین' دینِ اسلام نہیں ہے؟ کیا حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو یہ وصیت نہیں کی تھی: ﴿یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾﴾ (البقرۃ) ''اے بیٹو! بے شک اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا

ہے' سوتم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان''۔ اگر تمام انبیاء کا دین ایک ہی ہے' جیسا کہ قرآن و حدیث سے واضح ہوتا ہے' تو پھر یہ کہنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے پہلے انبیاء کی نماز اور حج کے لیے قبلہ کی حیثیت بیت اللہ کو تھی جبکہ حضرت سلیمانؑ کے بعد نماز اور حج کے لیے بیت المقدس کو بنیادی حیثیت حاصل تھی؟

۴) تقریباً تمام مناسک حج مقامات کے ساتھ خاص ہیں' مثلاً طواف' صفا اور مروہ کی سعی' مقامِ ابراہیم پر نفل پڑھنا' منیٰ کا قیام' میدانِ عرفات اور مزدلفہ کا قیام وغیرہ۔ بیت المقدس کو اگر بنی اسرائیل کا قبلہ مان لیا جائے تو بیت المقدس کے حج کرنا کا کیا مطلب ہے؟ دوسرے الفاظ میں بنو اسرائیل کا حج کیا تھا؟

۵) بنو اسماعیل کا حج تو زمانۂ جاہلیت میں بھی کسی نہ کسی بگڑی ہوئی شکل میں موجود تھا' لیکن کیا یہودی بھی آپ ﷺ کے زمانے میں بیت المقدس کا حج کرتے تھے یا آج کرتے ہیں؟ اگر نہیں' تو کیوں؟

۶) اگر بیت المقدس ہی قبلہ تھا تو یہود و نصاریٰ میں پھر قبلے کی تعیین میں اختلاف کیوں ہوا؟ یہود حق پر تھے یا نصاریٰ؟ اصل قبلہ قبۃ الصخرہ ہے یا بیت المقدس کا مشرقی حصہ؟

۷) اگر عمار صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہود کا قبلہ صحیح ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود یہود میں بھی تو اس قبلے کی تعیین میں اختلاف ہے کہ یہ صخرہ ہی ہے یا صخرہ کے قریب کوئی جگہ ہے۔ یہ کیسا قبلہ ہے جس کے صحیح مقام کا آج تک تعین ہی نہ ہو سکا؟

۸) عمار صاحب کتاب مقدس کی کوئی ایک بھی واضح اور صریح نص پیش کر سکتے ہیں جس میں یہ بیان ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو یہود کا قبلہ مقرر کیا تھا؟

۹) اگر عمار صاحب یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ (البقرۃ: ۱۴۵) میں اس بات کا اثبات کیا ہے کہ وہ یہود کا قبلہ ہے' تو ہم یہ کہتے ہیں پھر ﴿مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَيْهَا﴾ (البقرۃ: ۱۴۲) میں کس کے لیے قبلے کا اثبات ہے؟

۱۰) اللہ تعالیٰ نے صرف یہود کے قبلے کا اثبات نہیں کیا بلکہ نصاریٰ کے قبلے کا بھی اثبات کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ﴾. تو کیا کل تین قبلے ہیں؟

۱۱) حقیقت یہ ہے کہ قبلہ ایک ہی ہے جو کہ بیت اللہ ہے' باقی رہا قرآن کا مسجد اقصیٰ یا اس

کے مشرقی حصہ کو قبلہ کہنا تو یہ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے اعتبار سے کہا ہے نہ کہ خود اپنی طرف سے ان کے لیے کسی علیحدہ قبلے کو مقرر کرنے کا اثبات کیا ہے، جیسا کہ ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے لیے علیحدہ دین کا اثبات تو کیا ہے لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دین کو ان کے لیے مقرر کیا ہے اور پسند بھی کیا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ عمار صاحب ہیکل سلیمانی کو یہود کا قبلہ قرار دینے پر مصر ہیں اور اس کے لیے انہوں نے دلیل حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس دعا کو بنایا ہے جو کہ بیت المقدس کے فیوض و برکات کے حوالے سے کتاب مقدس میں بیان ہوئی۔ بیت المقدس کی برکات و فضائل سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن کیا کسی مقام کی برکات و فضائل کا بیان اس کے قبلہ ہونے کی ایک کافی دلیل ہے؟ یہ کیسا قبلہ ہے جس کے قبلہ ہونے کے بارے میں کوئی ایک بھی واضح نص قرآن و سنت تو کیا کتاب مقدس میں بھی موجود نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیت المقدس کی حیثیت نہ تو حرم کی ہے اور نہ ہی یہ یہودیوں کا قبلہ رہا ہے۔ بیت المقدس کو اپنا قبلہ قرار دینا یہودیوں کی اختراع ہے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد مسلمانوں کی آزمائش کے لیے ان کو وقتی طور پر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا جس کا تذکرہ بہت ساری روایات میں ملتا ہے۔ اس حکم خداوندی کی رو سے بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا جو حکم آپؐ پر نازل ہوا تھا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ پہلی مسلمان امتوں کا قبلہ بیت المقدس تھا بلکہ اس کی اصل وجہ مسلمانوں کی آزمائش تھی، جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ﴾ (البقرة: ١٤٣)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس عارضی قبلے کو منسوخ قرار دے کر اصل قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم جاری فرمایا۔ اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ (البقرة: ١٤٥)

''اور اے نبی ﷺ آپ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں''۔

قرآن مجید کی یہ نص اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ کے بیت المقدس کی طرف رخ

کر کے نماز پڑھنے کی وجہ یہودیوں کی اتباع نہیں تھی بلکہ آپ کو اللہ کی طرف سے یہ ایک حکم تھا۔
امام ابن کثیر اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وانه لا يتبع أهوائهم فى جميع أحواله و لا كونه متوجها الى بيت المقدس لكونها قبلة اليهود و انما ذلک عن أمر اللّٰه

''آپ کسی بھی معاملے میں یہودیوں کی اتباع نہیں کرتے تھے' اسی طرح آپ کا بیت المقدس کی طرف رخ کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ یہود کا قبلہ ہے بلکہ اس وجہ سے تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے آپ کو حکم تھا''۔

یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد قبۃ الصخرۃ کی طرف رخ کر نماز پڑھنے کا آغاز کیا جبکہ عیسائیوں میں قسطنطین دی گریٹ (۲۷۴ء تا ۳۳۷ء) وہ پہلا عیسائی بادشاہ گزرا ہے جس نے بیت المقدس کی مشرقی جانب نماز پڑھنے کی بدعت کا آغاز کیا۔

(۱) امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

قالوا و هو الذى ابتدع الصلوة الى الشرق و الا لم يصل قط أحد من أنبيائهم و اتباعهم الى الشرق و لم يشرع اللّٰه مكانا يصلى اليه الا الكعبة و الأنبياء الخليل و من قبله انما كانوا يصلون الى الكعبة و موسى ﷺ لم يكن يصلى الى البيت المقدس بل قالوا انه كان ينصب قبة العهد الى العرب و يصلى اليها فى التيه .فلما فتح يوشع بيت المقدس بعد موت موسى نصب القبة الى الصخرة فكانوا يصلون اليها فلما خرب بيت المقدس و ذهبت القبة صارت اليهود يصلون الى الصخرة لأنه موضع القبة و السامرة يصلون الى جبل هناک قالوا لأنه كان عليه التابوت(۱۸)

''ان کا کہنا ہے کہ مشرق کی طرف نماز پڑھنے کی بدعت کا آغاز قسطنطین اعظم نے کیا جبکہ نصاریٰ کے انبیاء اور ان کے متبعین میں سے کسی ایک نے بھی مشرق کی رخ کر کے نماز نہیں پڑھی اور اللہ تعالیٰ نے کعبہ کے علاوہ کسی مقام کو بھی شریعت اسلامیہ میں نماز کے لیے جہت نہیں بنایا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور ان سے ماقبل کے تمام انبیاء کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز نہیں پڑھتے تھے' بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خیمۂ عہد

کو عرب کی طرف رخ کر کے نصب کرتے تھے اور صحرا میں اس خیمہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جب حضرت یوشع بن نون نے بیت المقدس کو فتح کر لیا تو خیمہ کو صخرہ پر نصب کیا۔ پس بنی اسرائیل خیمہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ جب بیت المقدس ویران ہوا اور خیمہ بھی چھن گیا تو یہود صخرہ کی طرف رخ کر نماز پڑھنے لگے کیونکہ یہ خیمہ کی جگہ تھی اور سامرۃ (یہود سے علیحدہ ہونے والا ایک فرقہ) وہاں پر موجود ایک پہاڑ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے کیونکہ تابوتِ سکینہ اس پر موجود تھا''۔

۲) امام ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

استقبال أهل الكتاب لقبلتهم لم يكن من جهة الوحى و التوقيف من الله بل كان عن مشورة منهم و اجتهاد أما النصارى فلا ريب أن اللّٰه لم يأمرهم فى الانجيل ولا فى غيره باستقبال المشرق أبدا و هم مقرون بذلک و مقرون أن قبلة المسيح كانت قبلة بنى اسرائيل و هى الصخرة و انما وضع لهم شيوخهم و اسلافهم هذه القبلة و هم يعتذرون عنهم بأن المسيح فوض اليهم التحليل و التحريم و شرع الأحكام و ان ما حللوه و حرموه فقد حلله هو و حرمه فى السماء فهم مع اليهود متفقون على أن اللّٰه لم يشرع استقبال المشرق على لسان رسوله أبدا والمسلمون شاهدون عليهم بذلک و أما قبلة اليهود فليس فى التوراة الأمر باستقبال الصخرة البتة و انما كانوا ينصبون التابوت ويصلون اليه من حيث خرجوا فاذا قدموا نصبوه على الصخرة وصلوا اليه فلما رفع فصلوا الى موضعه و هو الصخرة و أماالسامرة فانهم يصلون الى طور لهم بأرض الشام يعظمونه و يحجون اليه و رأيته أنا وهو فى بلد نابلس و ناظرت فضلائهم فى استقباله وقلت هو قبلة باطلة مبتدعة فقال مشار اليه فى دينهم هذه هى القبلة الصحيحة واليهود أخطأوها لأن اللّٰه تعالىٰ أمر فى التوراة باستقباله عينا ثم ذكر نصا يزعمه من التوراة فى استقباله فقلت هذا خطأ قطعا على التوراة لأنها انما أنزلت على بنى اسرائيل فهم المخاطبون بها وأنتم فرع عليهم فيها وانما تلقيتموها عنهم وهذا النص ليس فى التوراة التى بأيدينا و أنا رأيتها و ليس هذا فيها فقال لى

صدقت انما هو فی توراتنا خاصة (۱۹)

''اہل کتاب کا اپنے قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا وحی سے یا اللہ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنا قبلہ آپس کے مشورے اور اجتہاد سے مقرر کیا۔ جہاں تک نصاریٰ کا معاملہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انجیل یا اس کے علاوہ کسی کتاب میں ان کو کہیں بھی مشرق کی طرف رخ کر نماز پڑھنے کا حکم کبھی نہیں دیا اور وہ اس بات کا خود بھی قرار کرتے ہیں اور اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ حضرت مسیح کا قبلہ وہی ہے جو بنو اسرائیل کا قبلہ ہے اور وہ صخرہ ہے اور ان کے شیوخ اور بڑوں نے مشرق کو قبلہ مقرر کیا اور وہ اپنے ان کبار شیوخ کی طرف سے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ حضرت مسیح نے ان کو تحلیل و تحریم اور تشریع احکام کا اختیار تفویض کیا تھا اور جس چیز کو انہوں نے حلال یا حرام قرار دیا۔ اس کو حضرت مسیح نے بھی آسمانوں پر سے حلال یا حرام قرار دے دیا۔ وہ یہود سے اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی رسول کی زبانی مشرق کو قبلہ نہیں بنایا اور مسلمان بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مشرق کو قبلہ نہیں بنایا۔ جہاں تک یہود کے قبلے کا تعلق ہے تو یہ بات تو واضح ہے کہ تورات میں کہیں بھی صخرہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم بیان نہیں ہوا ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ وہ جہاں سے بھی نکلتے تابوت کو نصب کرتے اور اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جب وہ بیت المقدس میں آئے تو انہوں نے اس تابوت کو صخرہ پر نصب کیا اور اس کی طرف رخ کر نماز پڑھی۔ پس جب تابوت کو اٹھا لیا گیا تو وہ صخرہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے کیونکہ یہ تابوت کی جگہ تھی۔ جہاں تک سامرہ (یہودیوں سے علیحدہ ہونے والا ایک گروہ) کا تعلق ہے تو وہ ارض شام میں موجود ایک پہاڑ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ وہ اس کی تعظیم کرتے تھے اور اس کا قصد بھی کرتے تھے اور میں نے اس پہاڑ کو دیکھا ہے' وہ شہر 'نابلس' میں ہے۔ اور میں (یعنی ابن قیم) نے جب اس فرقے کے علماء سے بحث کی اور ان سے کہا کہ تمہارا قبلہ باطل اور بدعت ہے تو انہوں نے کہا کہ ان کے دین میں اس قبلہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہی صحیح قبلہ ہے اور یہودیوں نے قبلہ کے تعین میں خطا کھائی ہے' اللہ تعالیٰ نے تورات میں اسی پہاڑ کے استقبال کا حکم دیا ہے۔ پھر ان میں سے ایک نے اس پہاڑ کے استقبال کے بارے میں ایک نص پیش کی جس کے بارے میں اس کا

1

گمان تھا کہ یہ تورات کی آیت ہے' تو میں نے کہا یہ کہنا تورات کے بارے میں قطعی خطا ہے' کیونکہ تورات بنواسرائیل پر نازل ہوئی اور وہ اس کے اول مخاطبین ہیں اور تم ان کی ایک فرع ہو اور تم نے تورات ان سے حاصل کی ہے' اور یہ نص جو تم پیش کر رہے ہو اس تورات میں نہیں ہے جو بنواسرائیل کے پاس ہے' اور میں نے اس تورات کو دیکھا ہے اور اس میں یہ نص موجود نہیں ہے' تو وہ (سامری عالم) مجھے کہنے لگا تم ٹھیک کہہ رہے ہو یہ نص ہماری خاص تورات میں ہے''۔

۳) امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ کی اس رائے کی تائید قرآنی نصوص' احادیث مبارکہ اور بعض تابعین و تبع تابعین کی آراء سے بھی ہوتی ہے۔

(ا) اس رائے کی تائید میں چند ایک قرآنی دلائل درج ذیل ہیں:

بنی اسرائیل کی غلامی کے زمانے میں' جبکہ وہ ابھی تک قوم فرعون کے ظلم سے آزاد نہ ہوئے تھے' اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ حکم دیا تھا:

﴿وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (یونس:۸۷)

''اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ بناؤ اور نماز قائم کرو''۔

یہاں بنی اسرائیل کو کس قبلے کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے؟ کیا بیت المقدس کی طرف؟ جس کی بنیاد بقول عمار صاحب کے سینکڑوں سال بعد حضرت سلیمان کے دور میں رکھی جانی تھی۔ یہ آیت مبارکہ اس مسئلے میں نص قطعی کا درجہ رکھتی ہے کہ بنی اسرائیل کو بھی اپنی نمازوں میں جس قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ بیت اللہ ہی ہے' کیونکہ اس آیت میں قبلہ کا لفظ مطلقاً استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی مراد وہ قبلہ ہے جو اُس وقت اور اس سے ماقبل کی اقوام میں بطور قبلہ معروف تھا اور وہ سب کے نزدیک بیت اللہ ہی ہے۔ امام طبریؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں صحابہ و تابعین کے اقوال نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

عن مجاهد قال قال ابن عباس فی قوله تعالیٰ ﴿وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً﴾ يقول وجهوا بيوتكم مساجدكم نحو القبلة ألا ترى أنه يقول ﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ﴾

''حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے ''وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً'' کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اپنے گھروں یعنی مساجد کو قبلہ رخ بناؤ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ'' (اس آیت مبارکہ

میں مساجد کے لیے ''بیوت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے)۔

عن سعید بن جبیر عن ابن عباس و اجعلوا بیوتکم قبلة یعنی الکعبة

''حضرت سعید بن جبیرؒ سے روایت ہے وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ''وَاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَةً'' کی تفسیر میں فرمایا کہ قبلہ سے مراد ''کعبة'' ہے''۔

عن مجاهد بیوتکم قبلة قال نحو الکعبة حین خاف موسی و من معه من فرعون أن یصلوا فی الکنائس الجامعة فأمروا أن یجعلوا فی بیوتهم مستقبلة الکعبة یصلون فیها سرا

''حضرت مجاہدؒ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ ''وَاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ'' سے مراد ہے کہ اپنے گھروں کو کعبہ کے رخ بناؤ۔ جب موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں نے اپنی عبادت گاہوں میں اکٹھے ہو کر نماز پڑھنے میں فرعون سے خوف محسوس کیا تو انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھروں کو کعبہ کے رخ بنالیں اور ان میں چھپ کے نماز پڑھیں''۔

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَکَ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّکَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (البقرة)

''اور اگر آپ ان اہل کتاب کے پاس ہر قسم کی نشانی ہی کیوں نہ لے آئیں وہ آپ کے قبلے کی پیروی ہرگز نہ کریں گے' اور نہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں' اور ان میں بعض ان کے بعض کے قبلے کی پیروی کرنے والا نہیں ہے' اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آ گیا تب تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے''۔

اس آیت مبارکہ کے اندازِ خطاب سے معلوم ہو رہا ہے کہ اہل کتاب سے بھی اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ بیت اللہ کو اپنا قبلہ بنائیں جو کہ تمام انبیاء کا قبلہ رہا ہے' لیکن اہل کتاب کی ضد اور اسلام دشمنی کے بارے میں خبر دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد ﷺ سے کہہ رہے ہیں **﴿وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَکَ﴾** کہ اگر آپ ان اہل کتاب کے پاس ہر قسم کی نشانی لے آئیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ بیت اللہ ہی اصل قبلہ ہے' اہل

کتاب کا بھی اور مسلمانوں کا بھی، تو پھر بھی یہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے۔

﴿وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ میں 'قِبْلَتَهُمْ ''سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو ان کا قبلہ بنایا ہے۔ اس کی دلیل آیت کا یہ اگلا ٹکڑا ہے: ﴿وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ﴾ کیونکہ اس بات پر تو اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین قبلے نہیں بنائے جبکہ آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے تین قبلوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک مسلمانوں کا قبلہ جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قبلہ مقرر کیا ہے، جیسا کہ اسی آیت مبارکہ کے سیاق وسباق سے واضح ہوتا ہے۔ دوسرا عیسائیوں اور تیسرا یہودیوں کا قبلہ ہے کہ جنھوں نے اپنی خواہش اور آزادمرضی سے بیت المقدس کی مشرقی جانب اور قبۃ الصخرہ کو قبلہ بنالیا تھا۔ امام ابن جریر طبریؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

وما لک یا محمد سبیل اتباع قبلتهم و ذلک أن الیهود تستقبل بیت المقدس لصلاتها وأن النصاریٰ تستقبل المشرق فأنی یکون لک السبیل الی اتباع قبلتهم مع اختلاف وجوهها

''اے محمد ﷺ آپ کے لیے ان کے قبلے کی پیروی کرنا جائز نہیں ہے اور یہ اس وجہ سے کہ یہود اپنی نماز میں بیت المقدس کی طرف جبکہ نصاریٰ اس کے مشرقی حصے کی طرف رخ کرتے ہیں۔ اے نبی ﷺ آپ کیسے ان کے قبلے کی پیروی کریں گے جبکہ خود ان میں آپس میں قبلے کی تعیین میں اختلاف ہے!''

سورۃ البقرۃ کی اگلی آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ (البقرۃ: ۱٤٦)

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی (یعنی اہل کتاب) وہ اس (یعنی بیت اللہ کے قبلہ ہونے) کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں''۔

امام ابن جریر طبریؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعرف هؤلاء الأحبار من الیهود والعلماء من النصاری أن البیت الحرام قبلتهم و قبلة ابراهیم و قبلة الأنبیاء قبلک کما یعرفون أبنائهم

''یہود ونصاریٰ کے علماء یہ جانتے ہیں کہ مسجد حرام ان کا قبلہ ہے اور یہی حضرت ابراہیمؑ اور آپ سے پہلے تمام انبیاء کا قبلہ تھا جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں''۔

اس آیت مبارکہ میں بعض مفسرین نے ''یَعْرِفُوْنَهٗ'' کی ضمیر ''ہ'' کو اللہ کے رسول ﷺ کی

طرف لوٹایا ہے، لیکن ''ہ'' ضمیر کو اللہ کے رسول ﷺ کی طرف لوٹانا قرآن کے سیاق وسباق کے خلاف ہے۔ آگے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرة)

''اور ان میں ایک گروہ ایسا ہے کہ وہ حق بات (یعنی بیت اللہ ہی کے اصل قبلہ ہونے) کو جانتے بوجھتے چھپا رہے ہیں''۔

امام ابن جریر طبریؒ ﴿وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وذلک الحق هو القبلة التی أوجه اللّٰه عزوجل اليها نبيه محمدًا ﷺ يقول فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ التی كانت الأنبياء من قبل محمد يتوجهون اليها فكتمها اليهود و النصاری فتوجه بعضهم شرقا و بعضهم نحو بيت المقدس و رفضوا ما أمرهم اللّٰه به

''الحق سے مراد قبلہ ہے جس کی طرف رخ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دیا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ مسجد حرام کی طرف اپنا رخ پھیر لیں جس کی طرف آپ سے پہلے تمام انبیاء رخ کرتے تھے، پس یہود ونصاریٰ نے اصل قبلے (یعنی بیت اللہ) کو چھپا لیا اور کسی نے مشرق کی طرف رخ کیا اور کسی نے بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنایا اور انہوں نے اس کا انکار کیا جس کا اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا''۔

اگلی آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾ (البقرة)

''یہ (یعنی بیت اللہ کا قبلہ ہونا) حق ہے آپ کے رب کی طرف سے، پس آپ (بیت اللہ کے ہی قبلہ ہونے میں) شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں''۔

امام ابن جریر طبریؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ای فلا تكونن من الشاكين فی أن القبلة التی وجهتک نحوها قبلة ابراهيم خليلی عليه السلام و قبلة الأنبياء غيره

''اے نبی ﷺ آپ اس بارے میں بالکل بھی شک میں مبتلا نہ ہوں کہ جس قبلہ کی طرف ہم نے آپ کا رخ کیا ہے وہی میرے خلیل ابراہیم علیہ السلام اور ان کے علاوہ تمام انبیاء کا قبلہ ہے''۔

اس سے اگلی آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (البقرۃ:۱۴۸)

''اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے وہ اس کی طرف اپنے آپ کو پھیرنے والا ہے' پس تم (اے مسلمانو) نیکیوں میں سبقت لے جاؤ''۔

امام طبریؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ای قد بینت لکم أیها المؤمنون الحق و هدیتکم القبلة التی ضلت عنها الیهود و النصاری و سائر الملل غیرکم فبادروا بالأعمال الصالحة شکرا لربکم

''اے اہل ایمان! میں نے تمہارے لیے حق بات کو واضح کر دیا تھا اور اس قبلے کی طرف تمہاری رہنمائی کی ہے کہ جس قبلے سے یہود و نصاریٰ اور تمہارے علاوہ تمام مذاہب بھٹک گئے تھے' پس تم اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے نیکی کے کاموں میں جلدی کرو''۔

ب) بعض ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ بیت المقدس یہود کا قبلہ نہیں ہے' بلکہ ان کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی تھا۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں:

کُنَّا عِنْدَ ابْنِ عَبَّاسٍ فَذَکَرُوا الدَّجَّالَ اَنَّهُ قَالَ مَکْتُوْبٌ بَیْنَ عَیْنَیْهِ کَافِرٌ . فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَمْ اَسْمَعْهُ وَلٰکِنَّهُ قَالَ : ((اَمَّا مُوْسٰی کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَیْهِ اِذَا انْحَدَرَ فِی الْوَادِی یُلَبِّیْ)) (۲۰)

''ہم ابن عباسؓ کے پاس تھے کہ لوگوں نے دجال کا تذکرہ کیا کہ آپ نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوگا تو ابن عباس نے کہا: میں نے یہ بات اللہ کے رسول ﷺ سے نہیں سنی بلکہ میں نے آپؐ سے سنا ہے آپؐ فرما رہے تھے کہ جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ ہے تو گویا میں ان کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ وادی میں تلبیہ کہتے ہوئے اُتر رہے ہیں''۔

یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل بھی حج کرنے کے لیے بیت اللہ کا ہی قصد کرتے تھے۔ علامہ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

و فی الحدیث أن التلبیة فی بطون الأودیة من سنن المرسلین

''اور اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ وادیوں کے درمیان میں تلبیہ کہنا رسولوں کی سنت ہے''۔

ایک دوسری روایت میں حضرت یونس بن متیٰ علیہ السلام کا بھی تذکرہ ہے۔حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ بِوَادِی الْاَزْرَقِ فَقَالَ : ((اَیُّ وَادٍ هٰذَا؟)) قَالُوا هٰذَا وَادِی الْاَزْرَقِ ، فَقَالَ : ((كَاَنِّی اَنْظُرُ اِلٰی مُوْسٰی عَلَیْهِ السَّلَام وَهُوَ هَابِطٌ مِنَ الثَّنِیَّةِ وَلَهٗ جُؤَارٌ اِلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ بِالتَّلْبِیَةِ)) حَتّٰی أَتٰی عَلٰی ثَنِیَّةِ هَرْشَاءَ فَقَالَ: ((أَیُّ ثَنِیَّةٍ هٰذِهٖ)) قَالُوْا : ثَنِیَّةُ هَرْشَاءَ، قَالَ: ((كَاَنِّیْ أَنْظُرُ اِلٰی یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی عَلٰی نَاقَةٍ حَمْرَاءَ جَعْدَةٍ عَلَیْهِ جُبَّةٌ مِنْ صُوْفٍ خِطَامُ نَاقَتِهٖ خُلْبَةٌ قَالَ هَشِیْمٌ یَعْنِی لِیْفٌ وَهُوَ یُلَبِّیْ)) (۲۱)

''حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا گزر وادیٔ ازرق سے ہوا تو آپؐ نے سوال کیا: ''یہ کون سی وادی ہے؟'' صحابہؓ نے کہا: یہ وادیٔ ازرق ہے۔اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''گویا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گھاٹی سے اترتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور وہ بلند آواز سے تلبیہ کہہ رہے ہیں۔پھر آپ ﷺ ہرشاء کی گھاٹی پر آئے اور آپؐ نے پوچھا: ''یہ کون سی گھاٹی ہے؟'' صحابہؓ نے کہا: یہ ہرشاء کی گھاٹی ہے' تو آپؐ نے فرمایا: ''گویا میں یونس بن متی کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک سرخ موٹی تازی مضبوط گوشت والی اونٹنی پر سوار ہیں اور انہوں نے اون کا ایک جبہ پہن رکھا ہے' ان کی اونٹنی کی لگام کھجور کے درخت کی چھال کی ہے اور وہ تلبیہ کہہ رہے ہیں''۔

اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام بیت اللہ کا حج کرتے تھے۔عمار صاحب بنواسرائیل کے کسی ایک نبی کے بارے میں یہ ثابت کردیں کہ اس نے بیت المقدس کا حج کیا ہو۔اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہ جن پر تورات نازل ہوئی' ان کا قبلہ بیت اللہ تھا۔اگر عمار صاحب یہ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دَور میں بنواسرائیل کا قبلہ تبدیل ہوگیا تھا تو اس کی کیا دلیل ہے کہ پہلے ان کا قبلہ بھی وہی تھا جو تمام انبیاء کا تھا' پھر حضرت سلیمانؑ کے دور میں ان کا قبلہ بیت المقدس قرار پایا؟ امر واقعہ یہ ہے کہ یہود نے اپنے اصل قبلہ' جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے چلا آ رہا تھا' سے انحراف کرتے ہوئے اپنے مشورے اور اجتہاد سے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرلیا تھا' جیسا کہ امام طبریؒ' امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔

اسی طرح بعض صحیح احادیث میں بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی فضیلت ایک عام مسجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ بیان کی گئی ہے۔ اگر بیت المقدس یہودیوں کا قبلہ اور عبادت گاہ ہے تو وہاں نماز پڑھنے کی کیا تک بنتی ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ کا آخری طرز عمل یہ تھا کہ آپ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی یہودیوں کی مخالفت کرتے تھے، چہ جائیکہ آپ مسلمانوں کو ان کے قبلے اور عبادت گاہ میں جا کر نماز پڑھنے کی ترغیب دلائیں۔

ج) بعض تابعین اور تبع تابعین کی آراء سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ ثلاثہ میں یہ رائے بہت عام تھی کہ تمام انبیاء کا قبلہ بیت اللہ ہی رہا ہے اور بیت المقدس کو قبلہ قرار دینا یہودیوں کی ایک اختراع تھی اور یہودیوں کی اسی اختراع کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے آزمائش بناتے ہوئے بیت المقدس کو کچھ عرصہ کے لیے ان کا عارضی قبلہ قرار دیا۔ ان میں سے چند ایک اقوال یہ ہیں:

عن السدی: ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآئَهُمْ﴾ يعرفون الكعبة أنها هی قبلة الأنبياء كما يعرفون أبنائهم وروی عن قتادة و الربيع بن أنس و الضحاک نحو ذلک

''حضرت سدیؒ سے روایت ہے کہ ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآئَهُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ یہ بات، کہ کعبہ ہی تمام انبیاء کا قبلہ ہے، اس طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔ قتادہ، ضحاک اور ربیع بن انس سے بھی اسی قسم کا مفہوم مروی ہے''۔

عن الربيع قوله تعالیٰ: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآئَهُمْ﴾ عرفوا قبلة البيت الحرام هی قبلتهم التی أمروا بها كما عرفوا ابنائهم

''حضرت ربیعؒ سے روایت ہے کہ آیت مبارکہ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآئَهُمْ﴾ سے مراد ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ مسجد حرام ہی وہ قبلہ ہے جس کے استقبال کا ان کو حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں''۔

عن الربيع ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾ يقول فلا تكونن فی شک من ذلک فانها قبلتک و قبلة الأنبياء قبلک

''حضرت ربیعؒ سے مروی ہے، وہ ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾ کے بارے میں کہتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اے محمد ﷺ آپ اس بارے میں کسی قسم کے

شک وشبہ میں مبتلا نہ ہوں کہ کعبہ ہی آپ ؐ کا بھی اور آپ ؐ سے پہلے انبیاء کا بھی قبلہ تھا‘‘۔

عن أبی العالية قال : قال اللّٰه لنبيه :﴿اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ﴾ فيقول لا تکون فی شک يا محمد ان الکعبة هی قبلتک و کانت قبلة الأنبياء قبلک

’’حضرت ابوالعالیہؒ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے کہا ہے: ﴿اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد ﷺ آپ اس بارے میں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہ ہوں کہ کعبہ ہی آپ کا بھی قبلہ ہے اور آپ سے پہلے تمام انبیاء کا بھی قبلہ تھا‘‘۔

عن أبی العالية ﴿وَلِکُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيۡهَا﴾ قال لليهود وجهة هو موليها وللنصرانی وجهة هو موليها و هداکم اللّٰه أنتم ايتها الأمة القبلة التی هی القبلة وروی عن مجاهد أحد قوليه والضحاک وعطاء والسدی والربيع نحوذلک

’’حضرت ابوالعالیہؒ ﴿وَلِکُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيۡهَا﴾ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہود کے لیے ایک جہت ہے جس کی طرف وہ رخ کرتے ہیں‘ اسی طرح عیسائیوں کے لیے ایک جہت ہے جس کی طرف وہ رخ کرتے ہیں‘ اور اے امت مسلمہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری اس قبلے کی طرف رہنمائی کی ہے جو کہ اصل قبلہ ہے۔اس آیت کی تفسیر میں امام مجاہدؒ کے دو قوال میں سے ایک قول یہی ہے۔اس کے علاوہ ضحاک‘ عطاء‘ سدی اور ربیع سے بھی اس قسم کا قول نقل کیا گیا ہے‘‘۔

د) دلیل استصحاب سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہود کا اصل قبلہ بیت اللہ ہی ہے۔ڈاکٹر وہبہ الزحیلی استصحاب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وعند الأصوليين هو :الحکم بثبوت أمر أو نفيه فی الزمان الحاضر أو المستقبل ‘بناء علی ثبوته أو عدمه فی الزمان الماضی ‘لعدم قيام الدليل علی تغييره (۲۲)

’’اصولیین کے نزدیک‘ زمانہ حال یا مستقبل میں‘ کسی حکم کے ثبوت یا عدم ثبوت کی بنیاد ماضی میں اس حکم کے ثبوت یا عدم ثبوت پر رکھنا‘ جبکہ اس حکم کے تبدیل ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو‘ استصحاب کہلاتا ہے‘‘۔

قرآنی نصوص، احادیث صحیحہ اور اجماع امت سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد بنو اسرائیل اور بنو اسماعیل کا قبلہ بیت اللہ تھا۔ اب اگر کوئی شخص اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بیت اللہ کو منسوخ کر کے بیت المقدس کو بنو اسرائیل کا قبلہ مقرر کیا گیا تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس بات کی دلیل پیش کرے کہ بیت اللہ کو بنو اسرائیل کے لیے بطور قبلہ منسوخ کر دیا گیا ہے۔ کیا اسرائیلیات (کتاب مقدس) میں اس نسخ کی کوئی دلیل ہے؟

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بیت المقدس مسلمانوں کا تو عارضی طور پر قبلہ مقرر کیا گیا لیکن یہ یہود کا قبلہ کبھی بھی نہیں رہا۔ قرآن و حدیث تو کیا اسرائیلیات (کتاب مقدس) میں بھی کوئی ایک بھی ایسی نص نہیں ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے لیے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا تھا۔ بلکہ قرآنی آیات، بہت ساری روایات، تاریخی حقائق اور ائمہ سلف کی آراء اس موقف کی تائید کرتی نظر آتی ہیں کہ یہود کا قبلہ بیت اللہ ہی تھا۔ جب یہ ثابت ہوا کہ بیت المقدس نہ تو یہود کی عبادت گاہ ہے اور نہ ہی یہ ان کا قبلہ ہے، تو یہ دعویٰ بھی باطل ہے کہ بیت المقدس پر یہودیوں کا حق ہے۔ بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ بیت المقدس ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا﴾ کے مطابق مسلمانوں کی عبادت گاہ اور سابقہ قبلہ ہے، اس لیے وہی اس کی تولیت کا بھی شرعی حق رکھتے ہیں۔

دوسروں کے موقف میں شکوک وشبہات پیدا کرنا اور اپنے موقف کے اثبات کے لیے ایک دلیل بھی پیش نہ کر سکنا، اگر اہل فن کے ہاں تحقیق اسی کو کہتے ہیں تو واقعتاً عمار صاحب کا مضمون ایک تحقیقی مقالہ ہے، کیونکہ عمار صاحب نے اپنے پورے مضمون میں یہی کام کیا ہے۔ میں نے عمار صاحب کے مضمون کا کئی دفعہ بغور مطالعہ کیا لیکن اس طویل مضمون میں مجھے سوائے حضرت سلیمان علیہ السلام کی دُعا کے کوئی اور عبارت ایسی نظر نہیں آئی جسے عمار صاحب نے بیت المقدس کو یہود کا قبلہ ثابت کرنے کے لیے پیش کیا ہو۔ عمار صاحب سے گزارش ہے کہ انہوں نے علماء کے موقف کا ردّ تو بہت اچھا کر دیا ہے، اب ذرا اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے بھی کوئی دلیل پیش کریں۔ دوسروں کے موقف کا رد کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کا موقف ثابت ہو گیا ہے۔

حوالہ جات:

۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا۔

وصحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب۔ (الفاظ صحیح مسلم کے ہیں)

۲) صحیح البخاری،کتاب الجمعۃ،باب فضل الصلاۃ فی مسجد مکۃ و المدینۃ ۔ وصحیح مسلم، کتاب الحج، باب لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد۔

۳) فتح الباری مع صحیح البخاری ،کتاب أحادیث الأنبیاء ،باب قول اللہ تعالیٰ و اتخذ اللہ ابراھیم خلیلا۔

٤) سنن النسائی،کتاب المساجد،باب فضل المسجد الاقصیٰ والصلاۃ فیہ۔

٥) سنن أبی داوٗد،کتاب المناسك ،باب فی المواقیت۔

٦) سنن أبی داوٗد،کتاب الأیمان والنذور،باب من نذر أن یصلی فی بیت المقدس۔

۷) حدیث کا متن اور حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔

۸) دلائل النبوۃ ،امام بیھقی،جلد ۲،ص٤٥ ورواہ ابن کثیر فی تفسیرہ و اللفظ لہ ۔

۹) فتح الباری مع صحیح البخاری ،کتاب أحادیث الأنبیاء ،باب قول اللہ تعالیٰ و اتخذ اللہ ابراھیم خلیلا۔

۱۰) فتح الباری مع صحیح البخاری ،کتاب أحادیث الأنبیاء ،باب قول اللہ تعالیٰ و اتخذ اللہ ابراھیم خلیلا۔

۱۱) سنن النسائی،کتاب المساجد،باب فضل المسجد الاقصیٰ والصلاۃ فیہ (حدیث کا مکمل متن پیچھے گزر چکا ہے۔)

۱۲) ماھنامہ اشراق:جولائی ۲۰۰۳،ص۳٦۔

۱۳) زاد المعاد،امام ابن قیم،ص۹۔

۱٤) قصص النبیین،امام ابن کثیر،جلد ۱،ص۱٦٦۔

۱٥) ماھنامہ اشراق:جولائی ۲۰۰۳،ص۳٦۔

۱٦) ماھنامہ اشراق:جولائی ۲۰۰۳،ص٤۱۔

۱۷) ماھنامہ الشریعۃ:اکتوبر۲۰۰٦،ص۲٥۔

۱۸) الرد علی المنطقیین،امام ابن تیمیہ ،ص ۲۸۹و۲۹۰۔

۱۹) بدائع الفوائد ،امام ابن قیم ،جلد ٤،ص۱۷۱۔

۲۰) صحیح البخاری ، کتاب الحج،باب التلبیۃ اذا انحدر فی الوادی۔

۲۱) صحیح مسلم ،کتاب الایمان ،باب الاسراء برسول اللّٰہ الی السموات و رواہ الامام احمد فی مسندہ و اللفظ لہ ۔

۲۲) أصول الفقہ الاسلامی ،الدکتور وھبہ الزحیلی ،جلد ۱،ص۸٥۹۔

اخلاص

داعیانِ حق کے لیے کامیابی کی اساس

عتیق الرحمٰن صدیقی

کسی چیز کو ایسی تمام چیزوں سے جو اس کو مکدّر اور خراب کر دینے والی ہوں، پاک و صاف کرنے کو عربی زبان میں ''اخلاص'' کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

''الخالص (خالص) اور الصّافی دونوں مترادف ہیں، مگر الصّافی کبھی ایسی چیز کو بھی کہہ دیتے ہیں جس میں پہلے ہی سے آمیزش نہ ہو اور خالص اسے کہتے ہیں جس میں پہلے سے آمیزش ہو، مگر اسے صاف کر لیا گیا ہو۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: خَلَصْتُهُ فَخَلَصَ ''میں نے اسے صاف کیا تو وہ صاف ہو گیا''۔ اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے: خُلَاصُ الْخَمْرِ مِنْ نَسْجِ الْفِدَامِ ''جیسے شراب صافی (چھلنی) سے صاف ہو کر نکل آتی ہے''۔

قرآن میں ہے: ﴿وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا.....﴾ (الانعام:۱۳۹) ''اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو بچہ ان چارپایوں کے پیٹ میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے.....'' (مفردات القرآن [اردو])

شریعت کی اصطلاح میں اخلاص تمام عقائد اور عبادات و طاعات کو شرک و کفر، نفاق اور ہر طرح کی دُنیوی اغراض کی آمیزشوں، ملاوٹوں اور کھوٹ سے پاک و صاف کرنے کا نام ہے۔ مختصراً یہ کہ جب بھی کوئی نیک عمل اللہ کے حکم کی بجا آوری اور اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے کیا جائے اور اس کا محرک فاسد اغراض نہ ہوں تو اس کا نام اخلاص ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ:

﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ﴾ (الزمر:۲،۳)

''تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے اطاعت گزاری کو اسی کے لیے، آگاہ رہو کہ خالص اطاعت گزاری تو بس اللہ کے لیے ہے''۔

قرآن حکیم نے اُمت مسلمہ کی ایک خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ کے لیے مخلص ہوتے ہیں۔ معارف القرآن میں ہے کہ:

''حضرت سعید بن جبیرؒ نے اخلاص کے معنی یہ بتائے ہیں کہ: انسان اپنے دین میں مخلص ہو' اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اور اپنے عمل کو خالص اللہ کے لیے کرے' لوگوں کو دکھلانے یا ان کی مدح وشکر کی طرف نظر نہ ہو''۔ بعض بزرگوں نے کہا کہ اخلاص ایک ایسا عمل ہے جس کو نہ فرشتے پہچان سکتے ہیں اور نہ شیطان' وہ صرف بندے اور اللہ کے درمیان ایک راز ہے''۔ (معارف القرآن' جلد اوّل)

امام راغب اصفہانیؒ کہتے ہیں کہ حقیقتاً اخلاص ماسوی اللہ سے بیزار ہونے کا نام ہے۔

سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۫ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ﴾ (الاعراف:۲۹)

''(اے نبیؐ! ان سے) کہو کہ میرے ربّ نے تو راستی اور انصاف کا حکم دیا ہے' اور (اُس کا حکم تو یہ ہے کہ) ہر نماز (عبادت) کے وقت اپنے رُخ سیدھے رکھو اور اسی کو پکارو دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔''

''مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ'' (یعنی دین کو اس کے لیے خالص رکھ کر) کے الفاظ اس مقام کے علاوہ سورۂ یونس' العنکبوت' لقمان' غافر' البینہ اور سورۂ مریم میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ گویا ہر عبادت اور عمل کا خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا ضروری ہے' یعنی خدائے برتر کی ذات اور خوشنودی کے سوا اور کوئی غرض نہ ہو۔

انبیاء کرام علیہم السلام نے دین کی دعوت پیش کرتے ہوئے ہمیشہ یہ اعلان کیا کہ ان کی تبلیغ وتلقین اور تنذیر وتبشیر کے عمل میں جلب منفعت کا کوئی بھی پہلو کارفرما نہیں۔ وہ کسی ذاتی معاوضے کے طلب گار نہیں۔ وہ تو صرف انہی کی بھلائی کے طالب ہیں۔ وہ تمام تر مصیبتیں اور تکلیفیں اس لیے جھیل رہے ہیں کہ ان کی عاقبت سنور جائے اور وہ اللہ کی گرفت سے بچ جائیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾﴾ (الشُّعراء)

''اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں چاہتا' میری مزدوری تو اُسی کے ذمہ ہے جو

ساری دنیا کا پروردگار ہے۔''

حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی کہلوایا گیا:

﴿وَیٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالاً اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ.....﴾ (ھود:۲۹)

''اے میری قوم! میں تم سے اس پر دولت کا خواہاں نہیں' میری مزدوری تو اللہ ہی کے ذمہ ہے.....''

خود نبی اکرم ﷺ کو یہ کہہ دینے کا حکم ہوا:

﴿قُلْ مَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَھُوَ لَکُمْ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ ﴿۴۷﴾﴾ (سبا)

''کہہ دیجیے کہ میں نے تم سے جو اجرت چاہی ہو تو وہ تمہیں رکھو' میری اجرت تو اللہ پر ہے' اور وہ ہر بات پر گواہ ہے۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا ﴿۵۷﴾﴾ (الفرقان)

''کہہ دیجیے کہ میں (تمہاری) اس (رہنمائی) پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا' مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ پکڑے۔''

انبیاء کرام علیہم السلام نے دعوتِ حق کا کام بے غرضانہ طریقے سے کسی ذاتی نفع کے بغیر انجام دیا۔ اپنی تمام تر قوتیں اور محنتیں دینِ حق کے غلبہ و استیلاء کے لیے کھپا دیں۔ انہوں نے اس دوڑ دھوپ میں ہر طرح کے مصائب و شدائد کو برداشت کیا' ہر طرح کی دشمنی مول لی' اور یہ سب کچھ قوت و اقتدار کے حصول کے لیے نہیں بلکہ خلق خدا کی صلاح و فلاح کے لیے کیا۔ ظاہر ہے کہ ذاتی مفاد کی قربانی مکمل اخلاص کی مظہر ہوتی ہے اور اس میں کوئی نفسانی جذبہ کام نہیں کر رہا ہوتا۔ یہ خدمتِ بے مزد ہی ان داعیانِ حق کا سرمایۂ افتخار ہوتی ہے' تحسین و شہرت کی طلب کا یہاں شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہی کامیابی کی اساس ہے' اس کے بغیر نہ تو کوئی عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا قصہ بیان کرتے ہوئے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِھِمَا

﴿وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ﴾ (المائدۃ:۲۷)

''اور ان کو آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ بھی ٹھیک ٹھیک سنا دیجیے' جب ان دونوں نے قربانی کی تو اُن میں سے ایک کی طرف سے قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی طرف سے قبول نہیں ہوئی۔''

ہابیل نے دل کی آمادگی سے رضائے الٰہی کی خاطر بہترین دنبے کی قربانی پیش کی تھی اور قابیل نے بے دلی سے ناکارہ غلے کا ایک ڈھیر پیش کر دیا تھا۔ ہابیل کے اخلاص کی بدولت اس کی قربانی کو اللہ نے قبول فرمایا' مگر قابیل کے لیے اس کے عدم اخلاص کی بدولت درِقبولیت وا نہ ہوا۔ اس لیے کہ:

﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۷﴾ (المائدۃ)

''اللہ تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی حقیقی غایت ہے اور یہی اسلامی تعلیمات کی روح ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ ہی کو سرفراز فرماتا ہے اور ان کے اخلاص کی وجہ سے اور کسی کھوٹ اور آلائش سے پاک ہونے کی بنا پر انہیں کامیاب و کامران کرتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۳۳ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۴﴾ (الزمر)

''اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ مانا وہی لوگ ہیں تقویٰ والے۔ ان کے لیے ان کے ربّ کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں۔ یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا۔''

اور سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝۱۴۵ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۴۶﴾

''یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے' اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو (اُن میں سے) تائب ہو جائیں اور (اپنے طرزِ عمل کی) اصلاح کر لیں اور اللہ کے ساتھ چمٹ جائیں (اُس کا دامن تھام لیں) اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں' تو یہی لوگ مؤمنوں کے ساتھ ہیں۔ اور عنقریب اللہ

مؤمنوں کو ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔''

سورۃ البیّنۃ میں فرمایا:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ﴾

''اوران کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے۔''

دین کے معنی اطاعت' فرماں برداری اور غلامی کے ہوتے ہیں۔ اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ صرف اور صرف اسی کی پرستش اور بندگی کی جائے' احکام و اوامر میں اسی کی اطاعت کی جائے اور اس سب کچھ کا ہدف اللہ کی رضا اور اُخروی کامیابی ہو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث قدسی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى : اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا اَشْرَكَ فِيْهِ مَعِيَ غَيْرِيْ تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ))(۱)

''اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: میں شرک سے سب سے بڑھ کر مستغنی ہوں۔ جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ دوسرے کو شریک کیا تو میں اس کو اس کے شرک کے ساتھ چھوڑ دوں گا''۔

ایک اور روایت میں ہے کہ:

((..... فَاَنَا مِنْهُ بَرِيْءٌ وَهُوَ لِلَّذِيْ اَشْرَكَ))(۲)

''تو میں اس سے بری ہوں اور وہ عمل اسی کے لیے ہے جس کو اس نے شریک کیا''۔

ہندوستان کے معروف عالم دین سید احمد عروج قادری نے تفسیرِ مظہری کے حوالے سے یہ روایت اپنی کتاب میں نقل کی ہے:

''حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا: یا روح اللہ! اللہ کے لیے مخلص کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: جو صرف اللہ کے لیے عمل کرے' یہاں تک کہ وہ یہ بھی پسند نہ کرے کہ لوگ اس عمل پر اس کی تعریف کریں''۔ (اسلامی تصوف' ص ۶۷)

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الزهد و الرقائق' باب من اشرك فی عمله غير الله۔

(۲) سنن ابن ماجه' كتاب الزهد' باب الرياء و السمعة۔

اللہ کے مؤمن بندے جب اخلاص میں کامل ہو جاتے ہیں اور شیطان ان پر غلبہ پانے سے قاصر ہو جاتا ہے تو اللہ انہیں اپنی نمائندگی کے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صراحت کے ساتھ انہیں مخلَص (ل کے زبر کے ساتھ) کہا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّـآ اَخۡلَصۡنٰهُمۡ بِخَالِصَةٍ ذِكۡرَى الدَّارِ﴿۴۶﴾﴾ (صٓ)

''ہم نے ان کو ایک خالص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا (اور وہ) دارِ آخرت کی یاد (تھی)۔''

سورۂ مریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ مُوۡسٰٓى ۚ اِنَّـهٗ كَانَ مُخۡلَصًا وَّكَانَ رَسُوۡلًا نَّبِيًّا﴿۵۱﴾﴾

''اور ذکر کرو (اس) کتاب میں موسیٰ کا' یقیناً وہ ایک چیدہ (مخلَص) شخص تھے اور رسول نبی تھے۔''

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ:

﴿اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۲۴﴾﴾

''یقیناً وہ میرے منتخب بندوں میں سے ہے۔''

کسی غیر نبی کے لیے قرآن حکیم میں یہ لفظ (مُخلَص) استعمال نہیں ہوا۔

نیک اعمال کو نام و نمود سے بچائے بغیر اخلاص کا وجود ممکن نہیں۔ آدمی کوئی بھلائی کا کام اس لیے کرے کہ لوگ اس کی ستائش اور تعریف کریں یا اس ارادے سے کرے کہ اسے نیک نامی اور جاہ و منزلت حاصل ہو' یہ دونوں رویے اخلاص کی ضد ہیں اور اسے تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اصطلاح میں انہیں رِیا اور سُمعہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ:

((مَنۡ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ وَمَنۡ رَاءَ ى رَاءَ ى اللّٰهُ بِهٖ))(۱)

''جو شخص (نیکی میں) شہرت چاہے گا اللہ اسے رسوا کن تشہیر سے دوچار کرے گا اور جو دکھاوے کے لیے نیکی کرے گا اللہ اس کی نیت لوگوں کے سامنے کھول دے گا''۔

حضرت شدّاد بن اوس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((مَنۡ صَلّٰى يُرَائِىۡ فَقَدۡ اَشۡرَكَ وَمَنۡ صَامَ يُرَائِىۡ فَقَدۡ اَشۡرَكَ وَمَنۡ تَصَدَّقَ يُرَائِىۡ فَقَدۡ اَشۡرَكَ))(۲)

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الزهد والرقائق' باب من اشرك فی عمله غیر اللّٰه۔

(۲) مسند احمد۔

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی تو اس نے شرک کیا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا تو اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا تو اس نے شرک کیا۔''

اللہ کی راہ میں صدقہ دینے کا اجر اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ جس شخص کو صدقہ دیا جائے نہ تو اس پر احسان جتایا جائے اور نہ ہی اس کی دل آزاری کی جائے۔ یہ دونوں چیزیں اخلاص کو ختم کر دینے والی ہیں۔ فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لاَ يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ (البقرة)

''جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور پھر احسان نہیں جتاتے اُس پر جو انہوں نے خرچ کیا اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں ان کا اجر اُن کے رَبّ کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔''

یہ بھی فرمایا گیا کہ:

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝﴾ (البقرة)

''ایک بھلی بات (میٹھا بول) اور (کسی ناگوار بات پر ذرا سی) درگزر اُس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ایذا رسانی ہو۔ اور اللہ بے نیاز بردبار ہے''۔

اس سے اگلی آیت میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لاَ تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلاَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ﴾ (البقرة:٢٦٤)

''اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نہ کرو اُس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ آخرت کے دن پر۔''

تیسری چیز جو اخلاص کو برباد کر دیتی ہے' وہ یہ ہے کہ آدمی کے پاس اچھا اور عمدہ مال موجود ہو' مگر وہ ارادی طور پر خراب مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ﴾ (البقرۃ)

''اے ایمان والو! اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں اور اس میں سے وہ مال خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو جس کو (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے پر تو آمادہ ہو جاؤ لیکن (اگر وہی مال تم کو لینا پڑ جائے تو) بغیر آنکھیں میچے تم خود اس کو نہ لے سکو۔ اور اس بات کو خوب جان رکھو کہ اللہ بے نیاز ستودہ صفات ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الدھر میں اپنے اطاعت گزار بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا ۝﴾

''اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (اور اُن سے کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں خالص اللہ کی رضا کے لیے کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ، ہمیں تو اپنے ربّ سے اس دن (کے عذاب) کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔''

ان آیات میں اخلاص کے اعلیٰ درجے کی نشان دہی کی گئی ہے، یہ مرتبہ اللہ کی محبت میں سرشار بندوں کو نصیب ہوتا ہے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اخلاص کی نعمت انہی لوگوں کو میسر آتی ہے جن کے قلب و دماغ پر آخرت کی فکر غالب آ جائے اور یہی ان کے تمام دُنیوی نفع و نقصان کا پیمانہ بن جائے۔ اور یہ چیز نفس سے مسلسل جہاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ نفس کے سرکش گھوڑے کو لگام دیے بغیر اخلاص کی نعمت کا حصول ممکن نہیں۔ اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ نیتوں میں اخلاص پیدا کرنا عمل کرنے والوں پر تمام اعمال سے زیادہ سخت ہے۔

اخذ و استفادہ: (۱) تفہیم القرآن، جلد اول و سوم۔ (۲) سیرت النبی از شبلی، جلد پنجم۔ (۳) اسلامی تصوف از عروج قادری۔ (۴) مفردات القرآن۔

کردار سازی

''کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ.....''

ناپسندیدہ عادات واطوار کے لیے اسلام کی اصلاح
قرآن حکیم کے تعریضی اسلوب کی روشنی میں

حافظ محبوب احمد خان

قرآن کریم نے جہاں ''عبادالرحمٰن'' کی صفات کو مبرہن فرمایا ہے وہیں ''منافقین'' کے کردار کو بھی بخوبی واضح کیا ہے۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ جب کبھی حق کی دعوت کا کسی معاشرے میں آغاز ہوتا ہے تو وہ معاشرہ تین طرح کے افراد میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ پہلی قسم وہ ہوتی ہے جو اس دعوت کو اپنے ذاتی مفادات کو تج کر نہ صرف اپناتی ہے بلکہ آگے بڑھ کر اس کی داعی بھی بن جاتی ہے۔ دوسرے قسم کے افراد وہ ہوتے ہیں جن کے ذاتی ' معاشی' سیاسی مفادات اس دعوت کو قبول کرنے میں حائل ہو جاتے ہیں اور وہ ان مفادات کے تحفظ کے لیے دعوتِ حق کے مقابلے میں حزب الشیطان کا کردار ادا کرتے ہیں۔ جبکہ تیسری اور سب سے خطرناک قسم ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو نہ تو اس دعوتِ حق کو قبول کرتے ہیں اور نہ ہی اس سے انکار کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس دعوت سے حاصل ہونے والے فوائد بھی سمیٹ لیں اور پہلے سے حاصل مفادات بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ یہ گروہ ''تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو'' کے مصداق وقت کے ساتھ ساتھ کبھی حزب اللہ کی جانب جھکتا جاتا ہے اور کبھی حزب الشیطان کی گود میں پناہ لے لیتا ہے۔ قرآن کریم جہاں حزب اللہ اور حزب الشیطان کے اوصاف و کردار سے بحث کرتا ہے وہیں اس تیسرے گروہ کے کردار و نظریات کو بھی زیر بحث لاتا ہے۔

یہ قرآن کریم کا خاص اسلوب ہے کہ کسی ایک فرد یا گروہ میں پائی جانے والی خرابی کو اس فرد یا گروہ سے منسوب نہیں کرتا بلکہ چاہتا ہے کہ اس برائی کو تمام انسانوں سے دور کر دیا جائے

لہٰذا اس خرابی کو دور کرنے کے لیے اس فرد یا گروہ کو اجتماعی انداز میں مخاطب کرتا ہے۔ یہی اسلوب ہمیں سیرتِ طیبہ میں بھی نظر آتا ہے، جس کی چند ایک مثالیں اس مضمون میں بیان کی جائیں گی۔

اس کردار کو سامنے لانے کے لیے قرآن نے ﴿وَمِنَ النَّاسِ.....﴾ کے الفاظ اختیار فرمائے ہیں اور اسے کم و بیش نو مرتبہ منفی انداز میں اور ایک دو مرتبہ مثبت انداز میں بیان کیا ہے۔ اس اسلوب سے نہ صرف یہ کہ انسانی کردار و عمل کی یہ خرابیاں ظاہر ہوگئی ہیں بلکہ اس کے دو نتائج مزید سامنے آئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کے لیے آسان ہو گیا ہے کہ وہ ان ذرائل سے خود کو محفوظ رکھے۔ دوسرے یہ کہ ان رذائل کے حامل افراد کو آسانی سے پہچان لے۔ تاہم دوسرا نتیجہ آنے کے بعد بھی اگر خود کو نہ سنبھالا جائے تو اسے انسان کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اب آیئے اس کردار و عمل کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرتے ہیں:

(ا) قول و فعل میں تضاد اختیار کرنے والے

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲﴾ (البقرۃ)

''بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ مؤمن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کرتے ہیں، مگر دراصل وہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا، اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے''۔

(۲) اللہ کی محبت پر دوسروں کو ترجیح دینے والے

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾﴾ (البقرۃ)

’’کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔ کاش، جو کچھ عذاب کو سامنے دیکھ کر انہیں سوجھنے والا ہے وہ آج ہی ان ظالموں کو سوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔ جب وہ سزا دے گا اس وقت کیفیت یہ ہو گی کہ وہی پیشوا اور رہنما جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی، اپنے پیروؤں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے، مگر سزا پا کر رہیں گے اور ان کے سارے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا۔ اور وہ لوگ جو دنیا میں اُن کی پیروی کرتے تھے، کہیں گے کہ کاش ہم کو ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں، ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے۔ یوں اللہ ان لوگوں کے وہ اعمال جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں ان کے سامنے اس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے، مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔‘‘

(۳) معاشرے میں فساد پیدا کرنے والے

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ

اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

''انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے' مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے۔ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے' کھیتیوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے۔ حالانکہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اپنے وقار کا خیال اس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے''۔

(۴) اللہ کے بارے میں بغیر علم جھگڑا کرنے والے

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيۡطٰنٍ مَّرِيۡدٍ ۙ﴿۳﴾ كُتِبَ عَلَيۡهِ اَنَّهٗ مَنۡ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهۡدِيۡهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيۡرِ ﴿۴﴾﴾ (الحج)

''بعض لوگ ایسے ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اُس کے تو نصیب ہی میں یہ لکھا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا اسے وہ گمراہ کر کے چھوڑے گا اور عذابِ جہنم کا راستہ دکھائے گا۔''

(۵) علم کے بغیر اللہ کی راہ سے بھٹکانے والے

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍ ۙ﴿۸﴾ ثَانِىَ عِطۡفِهٖ لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِى الدُّنۡيَا خِزۡىٌ وَّنُذِيۡقُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ ﴿۹﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ﴿۱۰﴾﴾ (الحج)

''بعض اور لوگ ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر گردن اکڑائے ہوئے' خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہِ خدا سے بھٹکا دیں۔ ایسے شخص کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے

روز اس کو ہم آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''

(۶) نفع ونقصان کی بنیاد پر دین پر عمل کرنے والے

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾﴾ (الحج)

''اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے' اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آ گئی تو الٹا پھر گیا۔ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ۔ پھر وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارتا ہے جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ فائدہ۔ یہ ہے گمراہی کی انتہا۔ وہ ان کو پکارتا ہے جن کا نقصان ان کے نفع سے قریب تر ہے۔ بدترین ہے اس کا مولیٰ اور بدترین ہے اس کا رفیق۔''

(۷) دین میں آزمائش کو عذاب گردانے والے

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِىَ فِى اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِىْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾﴾ (العنکبوت)

''لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر مگر جب وہ اللہ کے معاملہ میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں پر ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا۔ اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح ونصرت آ گئی تو یہی شخص کہے گا کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں؟ اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور

منافق کون!''

(۸) بے راہ روی کی سرپرستی کرنے والے

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾ (لقمٰن)

''اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلامِ دلفریب خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے۔ ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتا ہے گویا کہ اُس نے انہیں سنا ہی نہیں' چنانچہ مژدہ سنا دو اسے ایک دردناک عذاب کا۔''

(۹) قرآن کے مقابلے میں آباء واَجداد کی پیروی کرنے والے

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝﴾ (لقمٰن)

''اور انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو' یا ہدایت' یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اُس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ (کیا یہ انہی کی پیروی کریں گے) خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو؟''

تاہم مندرجہ ذیل دو مقامات پر ''وَمِنَ النَّاسِ.....'' کا اسلوب مثبت کردار کے حامل افراد کے لیے اختیار کیا گیا ہے:

(۱) رضائے الٰہی میں اپنی جان کھپانے والے

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَـآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ۝۲۰۷﴾ (البقرۃ)

''دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے۔ اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔''

(۲) اللہ سے ڈرنے والے اور کتاب اللہ پر عمل کرنے والے

﴿وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ كَذٰلِكَ‌ؕ اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ غَفُوۡرٌ۝۲۸ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَتۡلُوۡنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرۡجُوۡنَ تِجَارَةً لَّنۡ تَبُوۡرَ ۝۲۹ لِيُوَفِّيَهُمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَيَزِيۡدَهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ‌ؕ اِنَّهٗ غَفُوۡرٌ شَكُوۡرٌ۝۳۰ وَالَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ مِنَ الۡكِتٰبِ هُوَ الۡحَـقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيۡرٌۢ بَصِيۡرٌ ۝۳۱ ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا‌ۚ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ‌ۚ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ‌ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَضۡلُ الۡكَبِيۡرُؕ۝۳۲﴾ (فاطر)

''اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں' اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں' یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے متوقع ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا (اس تجارت میں انہوں نے اپنا سب کچھ اس لیے کھپایا ہے) تاکہ اللہ ان کے اجر پورے کے پورے اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے ان کو عطا فرمائے۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور قدردان ہے۔ (اے نبیؐ) جو کتاب ہم نے تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی ہے وہی حق ہے' تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے آئی تھیں۔

بے شک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔ پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنا دیا اُن لوگوں کو جنہیں ہم نے (اس وراثت کے لیے) اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے اور کوئی بیچ کی راس ہے' اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے' یہی بہت بڑا فضل ہے۔''

اب آیئے سیرتِ طیبہ کی طرف کہ رسول اللہ ﷺ کے اصلاحی طرزِ عمل میں بھی یہ اسلوب دکھائی دیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی جن افراد کے درمیان گزری' ان سے سرزد ہونے والی غلطیوں کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل انتہائی اہمیت کا حامل ہے' کیونکہ آنحضرت ﷺ کو اللہ کی تائید و نصرت حاصل تھی اور آپؐ کے اقوال و افعال کی تائید یا تصحیح وحی کے ذریعے ہوتی رہتی تھی۔ تربیت کا فریضہ انجام دینے والا کوئی بھی فرد اگر ان طریقوں اور اسالیب پر عمل پیرا ہو تو اس کا یہ عمل زیادہ صحیح اور بہتر ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس اسلوب کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

(۱) صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ چند افراد نے اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن سے آنحضرت ﷺ کے وہ اعمال دریافت کیے جو آپؐ گھر میں انجام دیتے تھے۔ (بعد میں) ایک نے کہا: میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا۔ ایک نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا۔ ایک نے کہا: میں بستر پر نہیں سوؤں گا۔ (جب نبی اکرم ﷺ کو معلوم ہوا) تو آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا:

((مَا بَالُ اَقْوَامٍ قَالُوْا كَذَا وَكَذَا؟ لٰـكِنِّیْ اُصَلِّیْ وَاَنَامُ وَاَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ ' فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَيْسَ مِنِّیْ)) (۱)

''کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ فلاں فلاں بات کہتے ہیں۔ لیکن میں (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' (نفلی) روزہ بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے (کوئی تعلق) نہیں (رکھتا)''۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لونڈی حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو خریدنے کا ارادہ کیا۔ ان کے مالکوں نے اس شرط پر بیچنے پر رضامندی ظاہر کی کہ ولاء ان لوگوں کی ہو گی۔ جب نبی

اکرم ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے لوگوں میں کھڑے ہو کر اللہ کی حمد وثنا بیان کی۔ پھر فرمایا:

''کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ ایسی شرائط عائد کرتے ہیں جو اللہ کی کتاب (یعنی شریعت) میں نہیں؟ جو شرط بھی اللہ کی کتاب میں نہیں وہ کالعدم ہے' اگرچہ سو شرطیں ہوں۔ اللہ کا فیصلہ زیادہ درست ہے اور اللہ کی (بیان کی ہوئی) شرط زیادہ پختہ ہے۔ (قانون یہ ہے کہ) ولاء اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرے''۔ (۲)

(۳) حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک کام کیا' اور اس کی اجازت دی' لیکن کچھ لوگوں نے اس سے پرہیز کیا۔ نبی اکرم ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے خطبہ دیا۔ اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:

''کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ اس کام سے بچتے ہیں جو میں کرتا ہوں؟ اللہ کی قسم! میں اللہ کے بارے میں ان سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں (کہ کونسا کام اللہ کو پسند ہے اور کونسا نہیں) اور ان سب سے زیادہ اللہ کا خوف رکھتا ہوں''۔ (۳)

(۴) حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں قبلہ کی طرف بلغم لگا دیکھا۔ آپؐ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

''کیا وجہ ہے کہ ایک آدمی اپنے ربّ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے چہرے کی طرف تھوک دیتا ہے؟ کیا کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے آ کر اس کے چہرے پر تھوک دیا جائے؟ جب کسی کو بلغم پھینکنا ہو تو بائیں طرف اپنے پاؤں کے نیچے پھینکے' ورنہ اس طرح کر لے''۔ (۴)

(۵) سنن النسائی میں نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے صبح کی نماز پڑھی اور اس میں سورۃ الروم کی تلاوت کی' آپؐ کو قراءت میں التباس ہو گیا۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا:

''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور وضو اچھی طرح نہیں کرتے؟ قرآن میں یہی لوگ ہمیں مشابہ ڈالتے ہیں''۔ (۵)

جہاں تک اس اسلوب کے فائدوں کا تعلق ہے تو ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔ غلطی کرنے والے کی طرف سے منفی ردعمل کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اس طرح شیطان اس کے انتقامی جذبات کو ہوا دے کر انتقام کی طرف مائل نہیں کر سکتا۔ اس اسلوب کو زیادہ قبول کیا جاتا ہے اور دل پر اس کا زیادہ گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس سے غلطی کرنے والے کی پردہ پوشی ہوتی ہے۔ غلطی

کرنے والے کے دل میں نصیحت کرنے والے کی قدر ومنزلت اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ تعریض کے اس اسلوب کا مقصد یہ ہے کہ غلطی کرنے والے کو رسوا کیے بغیر مسئلہ سمجھا دیا جائے۔ لہٰذا یہ اسلوب اس وقت استعمال کرنا چاہیے جب اس کی غلطی عام لوگوں سے پوشیدہ ہو۔ لیکن اگر اکثر لوگوں کو اس کا علم ہو اور اسے معلوم ہو کہ اکثر لوگ یہ بات جانتے ہیں تو اس صورت میں یہ اسلوب سخت زجر وتوبیخ کا حامل اور غلطی کرنے والے کے لیے سخت تکلیف دہ بن جاتا ہے' بلکہ بعض اوقات تو وہ یہ تمنا کرنے لگتا ہے کہ کاش اسے براہِ راست تنبیہ کر دی جاتی' اور اس کے ساتھ یہ اسلوب اختیار نہ کیا جاتا۔ اس کی تأثیر میں اس سے بھی فرق پڑتا ہے کہ بات کہنے والا کون ہے؟ اور کس کے سامنے بات کی جا رہی ہے اور بات نصیحت اور خیر خواہی کے انداز سے کہی گئی ہے یا تنگ کرنے کے انداز سے؟ خلاصہ یہ کہ بالواسطہ کلام کا یہ انداز تربیت کا ایسا انداز ہے جس سے غلطی کرنے والے کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی' بشرطیکہ اسے استعمال کرتے ہوئے حکمت سے کام لیا جائے۔

حواشی

(۱) صحیح مسلم' کتاب النکاح' باب استحباب النکاح۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب المکاتب' باب استعانة المکاتب وسواله الناس۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب من لم یواجه الناس بالعتاب۔

(٤) صحیح مسلم' کتاب المساجد' باب النهی عن البصاق فی المسجد فی الصلوٰة وغیرها۔

(٥) سنن النسائی' کتاب الافتتاح' باب القراء ة فی الصبح بالروم۔

قرآن محفوظ کیوں ہے؟

ڈاکٹر محمد اقبال یوسف

یہ دُنیا کب وجود میں آئی' سائنس اس کا سراغ ابھی تک نہیں لگا سکی۔ پہلا انسان کب اس دنیا میں آیا' یہ بات بھی ابھی تک ایک معمہ ہے اور قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں۔ یقیناً یہ دنیا حق کے ساتھ پیدا کی گئی ہے اور انسان جو اس دنیا کا حسن ہے وہ کسی خاص مقصد کے لیے اس دنیا میں لایا گیا ہے۔ انسان آیا' پھر اس کا خاندان بنا' پھر قبیلے بنے' پھر اقوام بنیں' اب ان کے مفادات کا آپس میں ٹکراؤ پیدا ہوا۔ ہر کسی نے اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے ساتھ اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی' مگر اس کا نتیجہ فساد ہی نکلا۔

یہ دنیا چونکہ ایک خالق یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بنائی تھی اور اس کے اندر جو طبیعی قوانین (physical laws) تھے وہ اسی کے پیدا کردہ تھے جن کا انسان پہلے دن سے بلا چون و چرا ماتحت ہو کر رہ گیا' مثلاً ہر دن کے بعد رات آتی' خاص موسموں میں خاص چیزیں پیدا ہوتیں وغیرہ وغیرہ' اس لیے اب اس خالق نے چاہا کہ ان کی انسانی دنیا کے لیے بھی کچھ قوانین مقرر کرے۔ وہ قوانین اُس نے اپنے انبیاء ورُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے توسط سے وحی کے ذریعے بھیجے اور انبیاء ورُسلؑ نے ان قوانین کو صحیفوں کی صورت میں تحریر کروایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالطُّوْرِ ۝١ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝٢ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝٣﴾ (الطّور)

''قسم ہے طور کی' اور ایک ایسی کھلی کتاب کی' جو ایک رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے''۔

یعنی آسمانی ہدایت جو کبھی کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی' کبھی کوہِ زیتون پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر' اس کا فائنل ایڈیشن اب قرآن کی صورت میں تمہارے سامنے نرم جھلی پر تحریر شدہ موجود ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن پہلے دن سے لکھا گیا ہے اور یہ کاغذوں اور جھلیوں پر لکھا گیا۔

یہ ہدایتیں اللہ کی طرف سے انبیاء و رُسلؑ پر اتاری جاتی رہیں اس لیے ضرور اللہ نے گزشتہ انبیاء کو بھی ان کتابوں کو لکھنے کا حکم نازل کیا ہوگا۔ البتہ اللہ نے ان کتابوں کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا تھا۔ چنانچہ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان میں لفظی اور معنوی دونوں طرح کی تبدیلیاں کی گئیں' اور پھر وہ اپنی یا کسی دوسری قوم کی سازشوں کے نتیجے میں ناپید ہوگئیں۔ پھر کیا ہوا' سب جانتے ہیں کہ ان کے کچھ فقیہوں نے اپنی اپنی یادداشت سے دوبارہ ان کتابوں کو مرتب کیا اور اب وہ جیسی تیسی' صحیح یا غلط' ان کے ہاں آسمانی کتابیں تسلیم کی جاتی ہیں۔

یوں تو قرآن کے بہت سے اعجاز ہیں' مگر اس کا ایک اعجاز جو خصوصیت کے ساتھ بیان ہوا اور پھر اس کی تصدیق بھی ہوگئی' یہ ہے کہ یہ کتاب اس دنیا میں آج بھی اسی طرح جوں کی توں موجود ہے جیسی یہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں تھی' نہ اس کے لفظ بدلے' نہ سورتیں بدلیں اور نہ ہی ترتیب بدلی۔ اس کی بنیادی وجہ خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ دعویٰ تھا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر)

''ہم نے ہی اس الذکر (ضابطۂ حیات) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔

پھر اس کے ساتھ اس پر اس جملے کا اضافہ بھی فرما دیا:

﴿لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۴۲)

''باطل اس کے آگے یا پیچھے' کہیں سے بھی اس کے پاس نہیں آ سکے گا''

نبوت نے ختم ہونا تھا' سلسلۂ رشد و ہدایت بند ہونا تھا' اس لیے ضروری تھا کہ اس آخری آنے والی کتاب کو جوں کی توں باقی رکھا جائے' تاکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حجت آنے والے تمام لوگوں پر قائم ہو جائے۔ سورۃ الملک میں فرمایا گیا ہے کہ جب اہل جہنم سے پوچھا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا' تو وہ کہیں گے ہاں آیا تھا' مگر ہم نے اس کو جھٹلایا اور کہا کہ اللہ نے کوئی شے نازل نہیں کی۔ مگر اب جبکہ سلسلۂ رشد و ہدایت بند ہو گیا ہے تو کیا ہم یہ بات کہہ سکیں گے کہ اے اللہ ہمارے پاس تیرا کوئی نبی نہیں آیا جو ہمیں خبردار کرتا؟ ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ کیونکہ قرآن اب بشیر اور نذیر کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اب یہی ہمیں خوشخبری دیتا ہے اور یہی ہمیں خبردار کرتا ہے' یہی ہمارا پیشوا ہے اور اب یہی ان تمام انبیاء کا قائم مقام ہے جو ہر قوم میں آئے اور پھر موت پا کر دنیا سے چلے گئے۔ لفظ نبی کا مادہ ''نبأ'' ہے' یعنی خبر۔ اور قرآن اب خبر کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے اور ہم

سب کے لیے اتمامِ حجت ہے۔

قوموں کی تاریخ کو قرآن بڑی تفصیل سے بیان کرتا ہے' بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ سب سے پہلی کتاب جس نے تاریخ کو ایک سائنس کی صورت میں پیش کیا' وہ قرآن ہی ہے۔ آج کی علمی تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تاریخ کوئی عمرانیات کا علم نہیں' بلکہ اب یہ ایک مکمل سائنس ہے۔ آپ نے مطالعۂ قرآن کے دوران دیکھا ہوگا کہ قرآن کس طرح جامع انداز میں پھرا پھرا کر گزشتہ اقوام کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ ان قوانین کو بار بار دہراتا ہے جو قوموں کے عروج و زوال کا باعث بنے۔ اُسے وہ سنت اللہ (اللہ کی سنت) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یعنی ایک مقرر کردہ قاعدہ ہے جس پر عمل کرنے سے قومیں عروج سے ہم کنار اور زوال سے دوچار ہوتی ہیں۔ یہی ہوا ان قوموں کے ساتھ کہ جب انہوں نے اپنی نفسیاتی کیفیت کو نہ بدلا' اپنی روش سے نہ ہٹیں تو انہیں تباہ کر دیا گیا۔ کبھی آسمانی عذابوں کے ذریعے یا کبھی کسی اور قوم کے ہاتھوں ان پر عذاب کے کوڑے برسائے گئے۔ ان قوموں کا جرم کوئی الگ الگ نہ تھا۔ سب نے یکساں جرم کیا تھا اور وہ جرم تھا قانونِ الٰہی سے انحراف۔ یہ جرم غیر محسوس طریقے سے قوموں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور جب ظہورِ نتائج کا وقت آ جاتا ہے تو پھر مہلت نہیں دی جاتی ہے۔

قرآن قوموں کی تباہی کے لیے لفظ ہلاکت استعمال کرتا ہے جس کے معنی صرف مٹ جانا نہیں ہوتے' بلکہ یہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ قوم حکومت' سطوت' عزت اور اقبال کی بلندیوں سے گر کر نکبت' زوال اور پستی کے جہنم میں جا دھنستی ہے۔ اس قوم کے افراد سانس لیتے ہیں' چلتے پھرتے ہیں لیکن حیاتِ اجتماعیہ (جماعتی نظام' ملی زندگی) ان میں ختم ہو چکی ہوتی ہے' خواہ تعداد کے اعتبار سے وہ کروڑوں میں کیوں نہ ہوں۔ آیئے ذرا اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھیں کہ کیا یہ سب کچھ سچ نہیں ہے جو اوپر کہا گیا ہے؟

البتہ گھبرایئے نہیں' آج جو قومیں ہمیں اپنے عروج پر نظر آ رہی ہیں' جن کی روشنیوں نے ہماری آنکھیں چکا چوند کر دی ہیں' جن کی چمک دمک ہمارے جسموں پر اور پھر ہمارے ذہنوں پر بھی مسلط ہوتی جا رہی ہے ان کا یہ عروج بھی ابدی نہیں۔ ذرا اس آیت کو دیکھئے:

﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا

يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۳﴾ (الاحقاف)

''اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انہیں ان امور میں اِس قدر قدرت دے رکھی تھی جس قدر قوت تمہیں بھی نہیں دی' اور انہیں ہم نے سمع اور بصر اور قلب سب کچھ عطا کر رکھا تھا' مگر ان کے کان اور آنکھیں اور دل ان کے کچھ بھی کام نہ آئے' اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات (قانونِ الٰہی) کا انکار کیا کرتے تھے اور پھر نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں انہی باتوں نے آ کر گھیر لیا جن کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے''۔

ان اقوام میں بصارت' سماعت' دانش وبینش' علم و ہنر سب موجود ہے لیکن قانونِ الٰہی سے انکار کا پھندا اِن کے گلے میں آہستہ آہستہ تنگ ہو رہا ہے۔

سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اب باری کس کی ہے؟ کون اٹھے گا اس دنیا کو پھر سے گلزار بنانے کے لیے؟ کون اس کی خزاؤں کو بہاروں میں بدلے گا؟ کام تو یہ ہمارا ہے' مگر ہم سوئے ہوئے ہیں' کوئی ہے جو ہمیں جگائے؟ ہاں' ہمیں جگانے والے ہمارے اندر موجود ہیں' جو چیخ چیخ کر قرآن کی طرف بلا رہے ہیں' کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قوموں کے عروج وزوال کا معیار یہی کتاب ہے۔ مگر جگانے والوں سے زیادہ سلانے والے موجود ہیں۔ یہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے جنت کی سیر کراتے ہیں' معمولی معمولی نیکیوں کے ذریعے جنت میں داخلے کا ٹکٹ دے دیتے ہیں۔ یہ نعتوں اور منقبتوں کے ذریعے لوریاں سناتے ہیں' کہ جاگا ہوا آتا ہے اور جاگتے میں سو جاتا ہے۔ کچھ کہتے ہیں صرف عبادات میں مشغول رہو' کچھ کہتے ہیں صرف بھلائی کی تلقین کرو' مگر کسی کو جماعتی یکجہتی کی فکر نہیں۔ کوئی علم نہیں' کوئی منشور نہیں' بس افراد ہی ان کا ہدف ہیں۔ پوری سیرتِ انبیاء میں یہ بات کہیں نہیں ملے گی کہ انہوں نے صرف اور صرف افراد پر کام کیا ہو اور ان کی جماعت نہ رہی ہو' وہ جماعت جو اس دین کو نافذ کرنے کا بیڑا اٹھائے اس نبی کے ساتھ ساتھ چل رہی ہو۔ نبی کی دعوت کے نتیجے میں اسی وقت دو جماعتیں بن جاتی ہیں۔ کچھ لوگ نبی کے مشن کا اقرار کر کے اس کی تائید میں کام کرتے ہیں اور مسلم کہلاتے ہیں' جبکہ دوسری جماعت اس کا انکار کر دیتی ہے اور کافر کہلاتی ہے۔

اب کیا ہوگا اور کیا ہونا ہے' اس کا جواب میں آپ کو میڈیکل سائنس کے ذریعے سے دوں گا' کیونکہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ ڈاکٹر جب کسی زخم کو دیکھتا ہے جس میں مواد (pus) ہو یعنی وہ عفونت زدہ زخم (infected wound) ہو' تو وہ دو کام کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ

اس زخم سے مواد کو جراثیم کش محلول (antiseptic solution) سے صاف کرتا ہے' جسے ہم زخم کا دھونا (wound toilet) کہتے ہیں' پھر اس زخم سے کچھ مردہ حصے (dead tissues) کاٹ کر الگ کر دیتا ہے اور پھر اس کی جراثیم سے پاک (aseptic) پٹی (dressing) کر دیتا ہے۔ ساتھ ہی دوسرا کام یعنی ضدحیوی ادویات (antibiotics) کا استعمال شروع کر دیتا ہے جو زخم میں اربوں کی تعداد میں موجود جراثیم کے خلاف جنگ کرتی ہیں۔ مگر یہ جنگ ایک دن میں ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ دوسرے دن پٹی کھولی جاتی ہے تو پھر مواد ہوتا ہے' پھر dead سیل ہوتے ہیں' وہ پھر اسے دھوتا ہے' کاٹتا ہے اور پٹی کر دیتا ہے۔ antibiotics کا کورس جاری رہتا ہے اور ۱۰ دن' ۱۵ دن' ۲۰ دن بعد antibiotics جیت جاتی ہیں' جراحی کا تکلیف دہ عمل کارگر ثابت ہوتا ہے اور نئے خلیے (granulation tissues) نیچے سے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ جی ہاں dead tissues کے نیچے سے نئے خلیے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے ہی تازہ خلیے (cells) وافر مقدار میں جمع ہو جاتے ہیں وہ فوراً جلد کا ایک پیوند اس کے اوپر لگا دیتا ہے' یعنی skin grafting کر دیتا ہے۔ پھر زخم زخم نہیں رہتا' جسم کا ایک تازہ حصہ بن جاتا ہے۔

یہ قرآن محفوظ ہے' یہی ہمارا سرجن ہے' یہی ہماری antibiotic ہے' یہ ناسور کو کاٹے گا۔ تلخ ناکامیوں اور نامرادیوں کے بعد کامیابی اور کامرانی کی صورت اس کے استعمال سے نکلے گی۔ وہ نظامِ زندگی ضرور نافذ ہوگا جس کی بنیادیں ایمان پر مستحکم ہوں گی' جس کی عمارت اعمالِ صالحہ اور حق و استقامت کی باہمی تلقین کے اصرار پر مشتمل ہوگی۔ یہ نظام قائم ہو کر رہے گا۔ اسی لیے قرآن کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ اگر یہ نظام اللہ نے صرف ایک بار قائم کرنا ہوتا تو وہ تو ہو چکا تھا' پھر اس کے بعد قرآن کو محفوظ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر یہ اب بھی محفوظ ہے' اس لیے کہ پھر اسی سے دوبارہ ضرور بالضرور اسلام اور مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ ہونی ہے' چاہے کسی کو کتنا ہی برا لگے۔

﴿.....لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾

(التوبۃ:۳۳' الصف:۹)

''.....تاکہ وہ (اللہ تعالیٰ) اسے پورے جنس دین (تمام باطل نظاموں) پر غالب کر دے خواہ یہ بات ان لوگوں کو کتنی ہی بری لگے جو اللہ کی اطاعت میں دوسروں کو شریک

کرتے ہیں‘‘۔

لا اِلٰہ اِلّا اللہ میں سے ’’لا اِلٰہ‘‘ پر تو کام شروع ہو چکا ہے۔ لا اِلٰہ کا مرحلہ کچھ زمانے کے تقاضے اور کچھ اللہ کے نشتر (scalpel) پورا کر دیتے ہیں‘ dead tissues آہستہ آہستہ ہٹائے جاتے ہیں‘ پھر جب granulation tissues آ جائیں گے‘ یعنی ہموار شدہ زمین پیدا ہو جائے گی تو اس پر ’’اِلّا اللہ‘‘ کی عمارت استوار کر دی جائے گی‘ یعنی skin grafting ہو جائے گی۔

اُٹھو کہ قرآنی فکر کو عام کریں اور آئینی طریقے سے اس محفوظ کتاب کو آگے بڑھائیں۔ اُمت مسلمہ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے کیا ہو گا؟ مگر میں کہتا ہوں:

بات نکلے گی تو بہت دور تلک جائے گی!

فحاشی کا گٹر مشرف باسلام!

اُمِّ عمّار

حقوقِ نسواں کے حوالے سے بظاہر اچانک ہی شور وغلغلہ بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے بے حیائی' عریانی' فحاشی' مادر پدر آزادی' مساواتِ مَرد وزن اور بغاوتِ زوجین کو تحفظِ حقوقِ نسواں کا نام دے کر مشرف باسلام کرنے کی ناپاک کوششیں شروع کر دی گئیں اور اس فحاشی کے گٹر کو جو ہر گھر میں پھیل چکا ہے' جس کی بدبو سے ہر معقول خاص و عام پریشان ہے' یوں ہمارے اوپر مسلط کیا گیا گویا اصل کرنے کا کام ہماری حکومت کے پاس بس یہی رہ گیا ہے۔ اصل میں یہ سب کچھ بظاہر تو اچانک لگ رہا ہے مگر دراصل ع ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے'' کے مصداق ہمارے دنیاوی خداؤں یعنی مغربی آقاؤں کی طرف سے آرڈر ہے کہ مسلمانوں کے خاندانی نظام کو تباہ کر دینا۔ اور اسے تباہ کرنے کا بہترین ذریعہ عورت کو اُس کے اصل مقام سے ہٹا کر دینا ہی ہے۔ یہ سب تجربات پہلے خود انہوں نے اپنے ہاں کیے۔ عورت کو حیا سے تہی دامن کر کے بے حیا کیا' اُس کو عزت دینے کے بجائے بے عزت کیا' اُس کو شرم دلانے کے بجائے بے شرم کیا' اُس کو ستر سے عاری کر کے بے ستر کیا' اُس کو حجاب میں رکھنے کی بجائے بے حجاب کیا۔ عورت میں چونکہ خود نمائی کا مادّہ بہت زیادہ ہے' لہٰذا انہوں نے عورت کو اُبھارا اور ایک قدم مزید آگے بڑھا کر اُس کی خوبصورتی کو نشانہ بنایا۔ یہ عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے کہ جو اُسے خوبصورت کہتا ہے وہ اُسی کی طرف مائل ہو جاتی ہے' اس کو اپنا محسن سمجھتی ہے' اُس سے محبت کرنے لگتی ہے اور اس کا حکم بھی ماننے لگتی ہے۔ عورتوں میں بھیڑ چال کی طرح یہ چال سب سے کامیاب رہتی ہے۔ چنانچہ عورت کی اسی نفسیات کو قابو کر کے انہوں نے عورت کو بازار کی زینت بنایا۔ اپنی خوبصورتی سے خود اُس نے کیا فائدہ اٹھایا' یہ آج بھی اُس عورت سے پوچھ کر دیکھیں۔ مرد نے اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے اس کو جب چاہا سر پر بٹھایا' تاج پہ سجایا' اُس کی پوجا کی اور جب چاہا اُس کو جوتی کی زینت بنا دیا۔ مچھر مار

اور کیڑے مار دوائی کے لیبل پر بھی عورت کو دکھایا گیا' گویا مچھر نہیں بلکہ عورت کی شرم و حیا کو مارنا مقصود ہے۔لیکن تُف ہے اُس عورت پر کہ وہ جھوٹی انا اور خوبصورتی کے چکر میں گھن چکر بن گئی اور زمانۂ جاہلیت کی عورت کے برابر آ گئی۔

ہمارے دنیاوی خدا ایک قدم مزید آگے بڑھے اور خاندانی اقدار ختم کرنے کے درپے ہوئے۔ماں باپ اور اولاد اور میاں اور بیوی کا رشتہ ایسا مقدس رشتہ ہے جس کا تقدس کبھی بھی ختم نہیں ہوسکتا۔اس کا تعلق ہماری پوری معاشرتی زندگی سے ہے۔ہمارے دنیاوی خداؤں نے اس رشتے کی دھجیاں بکھیر دیں جو اصل میں بے حیائی اور فحاشی کا نتیجہ ہے۔یعنی زنا' کھلے یا چھپے۔ماں باپ' بہن بھائی اور میاں بیوی' ان تمام رشتوں میں مرد کے ساتھ عورت لازم وملزوم ہے۔لہٰذا شیطانی ہوس کو پورا کرنے کے لیے آزادی اور روشن خیالی کا پرچار شروع کر دیا گیا کہ عورت جس کے ساتھ چاہے آزادانہ رہ سکتی ہے۔جو کوئی اُس کو روکے وہ ظالم ہے' یہاں تک کہ اگر اس کا شوہر بھی اس کی بدچلنی پر سرزنش کرتا ہے یا مارتا ہے تو جواباً وہ بھی پوری کارروائی کرے' بلکہ عدالت میں پہنچ جائے' شیطانی عدالتیں اُس کی پشت پر ہیں۔عورت کے ساتھ یہ گھناؤنا کھیل وہ اپنے ہاں تو کھیل ہی چکے ہیں جس کے نتیجے میں وہاں کے حالات ہمارے سامنے ہیں۔وہاں کی عورت' عورت نہیں لگتی بلکہ وہ ''مرد نُما'' ہے' کیونکہ عورت کا تصور حیا سے ہے جو عورت کا زیور ہے اور عورت کی نسوانیت کی شرطِ لازم ہے۔اگر وہ بھی نہ رہی تو وہ مرد نما عورت ہے' اس سے زیادہ نہیں۔اسی وجہ سے آج کی عورت اکثر و بیشتر خواجہ سرا نظر آتی ہے..... یا پھر زمانۂ جاہلیت کی لونڈی۔

قصہ مختصر' جب ہم نے یہود و نصاریٰ کو دنیا کے خدا مان لیا' اُن کے احکامات کو اپنے لیے لائحہ عمل بنالیا' اُن کے ساتھ دوستیاں کر لیں تو ہمارے طور طریقے' رنگ ڈھنگ اور طرزِ بود و باش بھی اُن جیسا ہو گیا۔''آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے'' کے مصداق ہم بھی اُن کے رنگ میں رنگ گئے۔ان مغربی آقاؤں کو ہمارے نظام کا ایک گوشہ ان کے شیطانی اثر اور شر انگیزیوں سے کچھ بچا ہوا نظر آیا تو انہوں نے صدر پاکستان جناب پرویز مشرف کو اس گوشے کو بھی ''مشرف باسلام'' کرنے کا شرف بخشا کہ فحاشی کے گٹر کو پھیلاؤ اور اس کو روشن خیالی کا نام دو۔اور جب یہ گٹر ہر گھر میں گند مچا چکے' عورتیں بے حیا و بے غیرت اور بے شرم و بے وقوف بن چکیں' اور گھر کے اندر کے بجائے وہ گھروں سے باہر ''ترقی'' کے زینے پھلانگنا شروع کر

دیں اور اپنے شوہروں کے لیے باعثِ تسکین بننے کے بجائے غیر مردوں کے لیے نہ صرف تسکین کا باعث بنیں، بلکہ انہیں بدکاری کی دعوت دیں اور جنسی بے راہ روی عام ہو جائے تو اب اس کو ''تحفظ حقوقِ نسواں'' کا نام دو تا کہ عورتیں یہی سمجھیں کہ اُن کے گھر کے مرد اُن کی حفاظت میں ناکام رہے ہیں اور اب غیر مرد اُن کی حفاظت کریں گے۔ اور عورت کی حفاظت اب اس طرح ہو گی کہ عورت اور مرد جہاں سے چاہیں گے اور جیسے چاہیں گے اپنی اپنی ہوس پوری کریں گے اور اُن کو پورا پورا تحفظ دیا جائے گا اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس کام کو شریعتِ اسلامی سے نسبت دی جائے گی۔ یہ تو بعینہٖ وہی معاملہ ہے جو بنی اسرائیل کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ:

﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (البقرۃ)

''تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ تو تم میں سے جو لوگ ایسا کریں اُن کی سزا اِس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اور اللہ اُن حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔''

بالکل یہی معاملہ ہمارے ساتھ ہے کہ پہلے خوب بے حیائی پھیلائی، پھر اُس کو قابلِ عمل بنانے کے لیے اسلام کے نام کا غلط استعمال کیا۔ فحاشی اور بے حیائی تو اسلام میں حرام ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ.....﴾(الاعراف:۳۳)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ میرے ربّ نے تو بے حیائی کے کاموں کو حرام ٹھہرایا ہے چاہے وہ کھلے ہوں یا چھپے۔''

فحاشی کا آغاز بے حیائی سے ہوتا ہے۔ حدیث مبارکہ ہے:

((اِذَا لَمْ تَسْتَحِي فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ)) (۱)

''جب تو بے حیا ہو جائے تو پھر جو چاہے کرتا پھر''۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار۔ وکتاب الآداب، باب اذا لم تستحی فاصنع ما شئت۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ وَمَنْ یَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ فَاِنَّهٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (النور:۲۱)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ اور جو کوئی شیطان کے نقش قدم کی پیروی کرے گا تو وہ تو فحش اور بدی ہی کا حکم دے گا۔''

میں سمجھتی ہوں کہ تین چیزوں سے فحاشی کی تکمیل ہوتی ہے:

(۱) ہمارے مادر پدر آزاد نظریات

(۲) ہماری مادر پدر آزاد سیاست اور معیشت

(۳) ہمارا مادر پدر آزاد عمل اور اخلاق

ان چیزوں میں ہم آج غیر مسلم ممالک سے مقابلہ کرنے لگے ہیں۔ ہماری پارلیمنٹ اگرچہ خود کو خدا تو قرار نہیں دیتی لیکن احکامات خود اپنی آزاد مرضی سے نافذ کرتی ہے۔ ہم اگرچہ سؤر (خنزیر) تو نہیں کھاتے لیکن سود تو ہر ایک کھا رہا ہے۔ سود اور سؤر میں صرف ''د'' اور ''ر'' کا فرق ہے۔ ہمارے نظریات بظاہر تو لا الٰہ الا اللہ پر مبنی ہیں' لیکن ہم نے غیروں کو اپنے آقا اور خدا بنا رکھا ہے' اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے! اس لیے کہ وہ جو کہتے ہیں ہم مانتے ہیں۔ ہم اگرچہ محمد ﷺ کی محبت کے دعوے دار ہیں' لیکن ہمارا عمل اور اخلاق گواہی دیتا ہے کہ ہم شیطان سے محبت کرتے ہیں اور اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ اللہ کے تمام احکامات کو پامال کرنے کے بعد فحاشی ہمارا اوڑھنا بچھونا بن گیا ہے۔ یہ گٹر ہمارے گھروں کی زینت بن گیا ہے۔ اس کی بدبو کو ہم نے خوشبو اور تازگی کا نام دے دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہونے والے گندے اثرات کو ہم نے روشن خیالی کا نام دے دیا ہے۔ فحاشی کے گٹر کے جراثیموں سے پھیلنے والی بیماریوں کو ہم نے ثقافت' کلچر اور نئی تہذیب کا نام دے دیا ہے اور اب اس پر ''تحفظ حقوقِ نسواں'' کی مہر لگا دی گئی ہے۔ اس کو مشرف باسلام کرنے کے لیے قرونِ اولیٰ سے زنا کے حوالے سے چند ایک واقعات کے ذریعے تصدیق بھی کروائی جا رہی ہے اور گواہوں کے ضمن میں اسلام کا نقطۂ نظر ڈھٹائی سے سامنے رکھا جا رہا ہے۔ ان کے اس طرزِ عمل پر سورۃ البقرۃ کی متذکرہ بالا آیت مبارکہ صد فی صد صادق آ رہی ہے۔ قرآن تو فرماتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ (النور:۱۹)

''یقیناً جولوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے اُن کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے''۔

ہمارے الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا ایسے ذرائع عریانی اور فحاشی پھیلانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں اور ہمارے حکومتی ارکان ایسے شرمناک مناظر پر ''مولویوں'' کی آنکھیں بند کرواتے ہیں' حالانکہ خود اُن کی سماعت' بصارت اور عقل پر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ اُن کو یہ شوگر کوٹڈ گولیاں بڑی میٹھی لگتی ہیں جو حقیقت کے اعتبار سے سانپ' بچھو' پیپ' کھولتے ہوئے پانی اور خوفناک آگ کی طرح زہریلی اور جان لیوا ہیں۔ ان کے لیے دنیا اور آخرت میں ذلت ورسوائی ہے۔

قرآن اور حدیث ہماری یہ راہنمائی کرتے ہیں کہ اس گند سے کرۂ ارضی کو پاک کرو۔ اور اگر کسی سے برا کام سرزد ہو گیا ہے تو اب اس کی تشہیر نہ کرو کہ زبانِ خلق نقارۂ خدا بن جاتی ہے اور گند سے گند پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ گند پھیلانے کے تمام راستے شریعت اسلامی نے بند کر دیے ہیں۔ فحاشی کے گٹر پر ستر وحجاب کا ڈھکن رکھ دیا ہے۔ جب قرآن کا یہ حکم پورا ہو گا تو بے حیائی اس طرح نہیں پھیلے گی اور ایسے پاکیزہ معاشرے میں زنا ہرگز عام نہیں ہو گا۔ لہٰذا اس کی روک تھام کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے پاکیزہ نظام بنائیں' پھر ایسی حدود نافذ کریں۔

۞۞۞

خطبہ حجۃ الوداع
حقوقِ انسانی کا جامع منشور

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

حج ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن ہے۔ ارکان اسلام وہ ستون ہیں جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے۔ حج ایک عظیم عبادت اور اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر خصوصی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ کے بندے ہمہ وقت اللہ کی رحمت کے محتاج ہیں۔ خاص طور پر گناہوں کی بخشش تو ہر شخص کی دلی تمنا ہے۔ انسان کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے مہربان رب نے ۹ ذوالحجہ کے دن کو ادائیگی حج کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جس آدمی نے حج کیا اور اس میں نہ تو کسی شہوانی بات کا ارتکاب کیا اور نہ اللہ کی کوئی نافرمانی کی تو وہ گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو کر واپس ہوگا جیسا اُس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا تھا''۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

اور جو مسلمان استطاعت ہوتے ہوئے بھی اتنی بڑی نعمت سے فائدہ نہ اٹھائے اُس کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کے پاس سفرِ حج کا ضروری سامان ہو اور اس کو سواری میسر ہو جو اسے بیت اللہ تک پہنچا سکے اور پھر وہ حج نہ کرے تو کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔ اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اللہ کے لیے بیت اللہ کا حج فرض ہے اُن لوگوں پر جو اس تک جانے کی استطاعت رکھتے ہوں''۔ (جامع ترمذی)

حج کی فرضیت کا حکم راجح قول کے مطابق ۹ھ میں آیا اور اس کے اگلے سال ۱۰ھ میں اپنی وفات سے صرف تین مہینے پہلے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد کے ساتھ حج فرمایا جو ''حجۃ الوداع'' کے نام سے مشہور ہے۔ آپ ﷺ نے ذوالقعدہ میں حج کے ارادہ

کا اعلان کر دیا جس سے پورے عرب میں جوش وخروش کی لہر دوڑ گئی اور ہر مسلمان کی خواہش ہوئی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں فریضۂ حج ادا کرے۔ چنانچہ ایک جم غفیر رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مکہ کی جانب روانہ ہوا۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر آپؐ نے عصر کی نماز پڑھی۔ اگلے دن ظہر کی نماز کے بعد آپ ﷺ نے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے احرام باندھا اور ۴ ذوالحجہ کو مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے۔ جب آپؐ کی نظر بیت اللہ پر پڑی تو آپؐ نے فرمایا: ''اے اللہ تو اس گھر کو زیادہ عزت وشرف عطا فرما''۔ پھر آپؐ میدانِ عرفات میں تشریف لائے اور اپنی ناقہ قصواء پر سوار ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا جو خطبۃ حجۃ الوداع کہلاتا ہے۔ یہ خطبہ قیامت تک یادگار رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''لوگو! تمہارے خون اور تمہارے مال تم پر حرام ہیں' بالکل اس طرح جس طرح آج کے دن (یوم العرفہ) اور (ذوالحجہ کے) اس مبارک مہینے اور اس مقدس شہر مکہ مکرمہ کی حرمت ہے! (تم اس میں ناحق کسی کا خون کرنا اور کسی کا مال لینا حرام جانتے ہو) خوب ذہن نشین کر لو کہ جاہلیت کی ساری چیزیں میرے دونوں قدموں کے نیچے دفن اور پامال ہیں اور زمانۂ جاہلیت کے خون بھی معاف ہیں (یعنی اب کوئی مسلمان زمانۂ جاہلیت کے کسی خون کا بدلہ نہیں لے گا) اور سب سے پہلے میں اپنے گھرانے کے ایک خون ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کے بیٹے کے خون کی معافی کا اعلان کرتا ہوں جو قبیلہ بنی سعد کے ایک گھر میں دودھ پینے کے لیے رہتا تھا' اس کو قبیلہ ہذیل کے آدمیوں نے قتل کر دیا تھا۔ اور زمانۂ جاہلیت کے تمام سودی معاملات بھی میں ختم کر رہا ہوں اور اس باب میں بھی سب سے پہلے اپنے خاندان کے سودی مطالبات میں سے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے سودی تقاضوں کی معافی کا اعلان کرتا ہوں۔

اے لوگو! عورتوں کے حقوق اور ان کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ اس لیے کہ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے اور اللہ کے حکم اور اس کے قانون سے اُن کے ساتھ تمتع تمہارے لیے حلال ہوا ہے۔ اور تمہارا خاص حق اُن پر یہ ہے کہ جس آدمی کا گھر میں آنا اور تمہاری جگہ اور تمہارے بستر پر بیٹھنا تم کو پسند نہ ہو وہ اس کو اس کا موقع نہ دیں' لیکن اگر وہ یہ غلطی کریں (تو اصلاح کی خاطر) اُن کو کوئی ہلکی سی سزا دے سکتے ہو۔ اور ان کا خاص حق تم پر یہ ہے کہ اپنے مقدور اور حیثیت کے مطابق ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ اور میں تمہارے لیے وہ سامانِ ہدایت چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم اس سے وابستہ رہے اور اس کی

پیروی کرتے رہے تو پھر تم کبھی گمراہ نہ ہو گے' وہ ہے کتابُ اللّٰہ!

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم سے میرے متعلق پوچھا جائے گا (کہ میں نے تمہیں اللہ کے احکام پہنچائے یا نہیں) تو بتاؤ کہ وہاں تم کیا کہو گے اور کیا جواب دو گے؟''— حاضرین نے عرض کیا کہ ہم گواہی دیتے ہیں اور قیامت کے دن بھی گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام اور اس کے احکام ہمیں پہنچا دیے ہیں اور راہنمائی اور تبلیغ کا حق ادا کر دیا اور نصح و خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس پر آپ نے اپنی شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے اور لوگوں کے مجمع کی طرف اس سے اشارہ کرتے ہوئے تین دفعہ فرمایا:

''اے اللہ تو گواہ رہ! اے اللہ تو گواہ رہ! اے اللہ تو گواہ رہ!''

پھر حضرت بلالؓ نے اذان کہی پھر اقامت کہی' اور آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ اس کے بعد حضرت بلالؓ نے اقامت کہی اور آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی۔ (صحیح مسلم)

عرفہ کا یہ دن جمعہ کا دن تھا۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کی نماز کی بجائے ظہر کی نماز پڑھی اور پھر ساتھ ہی عصر کی نماز بھی پڑھ لی۔ یعنی جو خطبہ اس دن آپ نے دیا وہ جمعہ کا خطبہ نہ تھا بلکہ حج کا خطبہ تھا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے ایک سے زائد خطبے دیے جن کے الفاظ حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ یہ خطبات حقوقِ انسانی کا خوبصورت گلدستہ ہیں۔ اگر ان کے الفاظ کو سمجھ کر اُن پر عمل ہونے لگے تو انسانیت امن وسکون کا سانس لے۔ عین اُس وقت جب آپ میدانِ عرفات میں لوگوں سے مخاطب تھے تو تکمیل دین کے یہ الفاظ بصورت وحی نازل ہوئے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین منتخب کر لیا''۔

آپ ﷺ نے یہ آیت بھی وہاں پڑھ کر سنا دی اور تکمیل دین کا اعلان کر دیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ گہری وابستگی پیدا کی جائے اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے مطابق حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا شعور پختہ کیا جائے۔ ہر انسان اپنے اعمال کا جائزہ لے اور ہدایت کی راہ سے ادھر ادھر نہ ہو تو دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔ اس خطبے کو بجا طور پر حقوق انسانی کا جامع منشور کہا جاتا ہے۔000

1

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (41)

ترکی (9)

(TURKEY)

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

ترکی: فوجی انقلاب کے بعد

27 مئی 1960ء کو فوجی انقلاب آ گیا اور جنرل جمال گرسل کے زیرِ صدارت فوجی حکومت قائم کر دی گئی۔ یاد رہے کہ ترک فوج میں اتاترک کے سیکولر عناصر کا غلبہ ہے۔ فوجی انقلاب آ تو گیا، لیکن اس کو قائم رکھنا آسان نہ تھا۔ ترک عوام نے فوجی انقلاب کے فوراً بعد بحالیٔ جمہوریت کے لیے کام کرنا شروع کر دیا، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بحالیٔ جمہوریت کی سیاسی مہم میں پیپلز پارٹی کے رہنما عصمت انونو نے نمایاں حصہ لیا۔ عوام کی ان کوششوں کے نتیجے میں 20 جولائی 1961ء کو نیا آئین نافذ کیا گیا اور فوج عوام کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے بیرکوں میں واپس چلی گئی۔

ڈیموکریٹک پارٹی توڑ دی گئی تھی اور وہ نئے آئین کے نفاذ کے بعد بھی خلافِ قانون ہی رہی، لیکن اس پارٹی کے اثرات ملک میں بہت گہرے تھے۔ اس کے قائدین کے ساتھ فوجی حکومت کے ظالمانہ سلوک نے ترک عوام کو بے حد متأثر کیا تھا۔ چنانچہ جب نیا آئین نافذ ہوا تو ڈیموکریٹک پارٹی کے حامیوں نے، جن میں ترک فوج کے سابق کمانڈر انچیف راغب گش پالا نمایاں ہیں، حزبِ اختلاف یعنی جسٹس پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی۔ مسٹر پالا 1960ء کے فوجی انقلاب کے وقت تیسری فوج کے کمانڈر تھے جو روس کے محاذ پر دفاع کے لیے تیار کی گئی تھی۔ انقلاب کے بعد مسٹر پالا کو کمانڈر انچیف بنا دیا گیا، لیکن بعد میں ان کو فوج سے نکلنے پر مجبور کیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے فوج سے علیحدہ ہونے کے بعد جسٹس پارٹی (حزبِ عدالت) کی بنیاد ڈالی۔

جسٹس پارٹی نے اکتوبر 1961ء کے انتخابات میں حصہ لیا اور پارلیمنٹ میں تقریباً نصف

نشستیں حاصل کرلیں۔ جسٹس پارٹی کی یہ بڑی کامیابی تھی' کیونکہ ملک میں ابھی تک دہشت اور خوف و ہراس کی فضا تھی' اور ترکی کا صدر اب بھی وہی شخص تھا جو فوجی انقلاب لایا تھا' یعنی جنرل جمال گرسل۔ لیکن 1965ء میں جب دوسرا انتخاب ہوا تو جسٹس پارٹی واضح اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ 1961ء کے انتخابات میں جسٹس پارٹی نے جمہور خلق پارٹی کی 173 نشستوں کے مقابلے میں 158 نشستیں حاصل کی تھیں۔ ملی حرکت پارٹی نے 54 اور نئی ٹرکش پارٹی نے 65 نشستیں حاصل کی تھیں۔ اس کے برخلاف 1965ء کے انتخابات میں خلق پارٹی نے صرف 134 نشستیں' جبکہ جسٹس پارٹی نے 240 نشستیں حاصل کیں۔

بدیع الزماں سعید نورسی

لیکن ایک پارٹی کے اس طویل دورِ حکومت میں ترکی میں ایک ایسی شخصیت بھی موجود تھی جس نے خلق پارٹی کی مذہب بیزار پالیسی کا پامردی سے مقابلہ کیا اور انتہائی ناسازگار حالات میں اسلام کی ترجمانی کی۔ مخالفوں کے اعتراضات کے جواب دیے اور اسلام کی اہمیت و فضیلت کو واضح کیا۔ یہ بدیع الزماں سعید نورسی کی ذات تھی' جنہوں نے عربی سے ترکوں کی محبت کو قائم رکھا اور اتاترک کی لائی ہوئی نسلی قوم پرستی کی بجائے مسلم قومیت کی طرف آنے کی دعوت دی۔ سعید نورسی نے تیس سال تک قید و بند کی زندگی گزاری اور ہر قسم کی ملامتوں اور سازشوں کا جرأت و ہمت سے مقابلہ کیا' لیکن اپنی جدوجہد ترک نہیں کی۔

سلیمان دیمرل کی وزارت

اکتوبر 1965ء کے عام انتخابات میں جسٹس پارٹی کی کامیابی کے بعد سلیمان دیمرل نے حکومت بنائی۔ وہ گزشتہ ایک سال سے جسٹس پارٹی کے منتخب صدر تھے۔ وہ وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر 12/ مارچ 1971ء تک فائز رہے۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں انہوں نے دو مرتبہ مخلوط حکومتیں بنائیں' لیکن واحد جسٹس پارٹی کی حکومت بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ اپنے وقت کی سب سے ممتاز سیاسی شخصیت تھے۔ دلکش شخصیت کے مالک اور اچھے مسلمان تھے۔ اپنے محلے کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔

جسٹس پارٹی کی حکومت ایک طرح سے فوج کی نگرانی میں تھی۔ جنرل جمال گرسل کے بعد 28 مارچ 1966ء کو جودت صونائی صدر منتخب کیے گئے' لیکن وہ بھی فوج کے نمائندے تھے۔ بہرحال ملک میں کئی سال سیاسی استحکام رہا اور معاشی ترقی کی رفتار تیز رہی۔ اس دور میں خارجہ پالیسی میں بھی تبدیلی ہوئی۔ قبرص سے متعلق امریکہ کی یونان نواز پالیسی کی وجہ سے ترکی نے امریکہ پر انحصار کرنے کی پالیسی پر نظرثانی کی اور روس سے قریبی تعلقات قائم کیے۔ چنانچہ فولاد سازی کی صنعت میں روس نے وسیع پیمانے پر امداد دی۔ علاقائی تعاون برائے ترقی (آر سی ڈی) میں ترکی معاہدۂ استنبول کے

تحت 1964ء میں شامل ہو چکا تھا۔ ستمبر 1965ء میں ترکی نے پاکستان کو ہندوستان سے جنگ کے دوران قابل قدر فوجی امداد دی۔ ستمبر 1969ء میں سلیمان دیمرل نے اسلامی سربراہوں کی کانفرنس (او آئی سی) میں شرکت کر کے اتحادِ اسلامی کی طرف ایک اہم قدم اٹھایا۔ اس وقت تک ترکی کی حکومت اسلامی بنیاد پر قائم کسی بھی تنظیم میں شرکت کو سیکولرازم کے اصولوں کے خلاف سمجھتی تھی۔ معاہدۂ سعد آباد اور آر سی ڈی میں ایران اور پاکستان کے ساتھ شمولیت اسلامی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی' بلکہ علاقائی بنیاد پر تھی۔ لیکن رباط (مراکش) کی اسلامی سربراہی کانفرنس اسلامی بنیاد پر طلب کی گئی تھی' اس لیے ترکی کے سیکولر عناصر اور جمہور خلق پارٹی کے حلقوں میں اس پر سخت تنقیدیں ہوئیں' لیکن سلیمان دیمرل نے اس میں شمولیت کر کے جرأت مندانہ اقدام اٹھایا اور خارجہ پالیسی میں سیکولرازم کی ایک نئی تعبیر پیش کی' وہ یہ کہ سیکولرازم مسلم ممالک سے مذہبی بنیاد پر تعاون کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات کے فروغ کے سلسلے میں جسٹس پارٹی کی حکومت نے ڈیموکریٹک پارٹی کی پالیسی قائم رکھی۔ ملک میں دینی مدارس کا جال بچھا دیا گیا اور اماموں اور خطیبوں کے لیے تربیتی ادارے قائم کیے گئے۔ عدنان مندریس کے عہد حکومت میں نومبر 1959ء میں استنبول میں دینی مدارس کے لیے معلمین فراہم کرنے کے لیے اعلیٰ اسلامیات کا ایک مرکز قائم کیا گیا تھا۔ 1968ء میں ایسے مراکز کی تعداد چار ہو گئی تھی۔ اماموں اور خطیبوں کے تربیتی اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ ان اعلیٰ مراکز میں داخل ہوتے تھے۔ دنیاوی تعلیم کے سرکاری سکولوں کے لیے دینیات اور عربی کے اساتذہ فراہم کرنا بھی ان اداروں کا کام تھا۔

جسٹس پارٹی کے دورِ حکومت میں عربی رسم الخط میں لکھی ہوئی اہم کتابیں لاطینی رسم الخط میں شائع کرنے کا کام بھی شروع ہوا۔ اس منصوبے کے تحت ایک ہزار ایک ترکی کی کلاسیکی کتابیں لاطینی رسم الخط میں منتقل کرنا طے پایا تھا' لیکن پچاس ساٹھ کتابوں کی اشاعت کے بعد یہ منصوبہ سلیمان دیمرل کی حکومت ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

اکتوبر 1969ء کے عام انتخابات میں بھی جسٹس پارٹی نے بھاری اکثریت سے جیت لیے تھے۔ جسٹس پارٹی نے 254 نشستیں حاصل کیں' مگر جمہور خلق پارٹی نے صرف 144 نشستیں حاصل کیں۔ لیکن 1970ء اور 1971ء میں طلبہ' مزدوروں اور کسانوں میں بے چینی اور انتہا پسند عناصر کے باہمی تصادم نے ترکی میں امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیا' جس کا سہارا لے کر فوج نے 12 مارچ 1971ء کو سلیمان دیمرل کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

مخلوط حکومتوں کا دور

مارچ 1971ء سے اکتوبر 1973ء تک ترکی میں فوج کی نگرانی میں دائیں بازو کی کئی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اس دوران ملک کے کئی صوبوں میں مارشل لاء نافذ رہا اور بائیں بازو کی سرگرمیوں کو دبایا

گیا۔ اکتوبر 1973ء کے عام انتخابات میں کسی بھی پارٹی کو اکثریت حاصل نہ ہوسکی۔ خلق پارٹی نے 185، جسٹس پارٹی نے 149، ملّی سلامت پارٹی نے 48 اور نوتشکیل ڈیموکریٹک پارٹی نے 44 نشستیں حاصل کیں۔ 1966ء سے 1973ء تک جودت صونائی ترکی کے صدر رہے۔ اس کے بعد فخری کوروترک کو صدر منتخب کیا گیا۔ اگرچہ کوروترک بھی فوجی تھے، لیکن اُن کو فوج کے امیدوار کے مقابلے میں منتخب کیا گیا، کیونکہ وہ سیاسی لحاظ سے غیر جانب دار شخصیت تھے، جبکہ اُن سے پہلے منتخب ہونے والے فوجی صدر سیاسی طور پر جانب دار تھے۔ فخری کوروترک کے صدر ہونے کے بعد حکومت میں فوج کی شرکت ختم ہوگئی اور 25 جنوری 1974ء کو خلق پارٹی اور ملّی سلامت پارٹی نے مل کر مخلوط حکومت بنائی، جس میں خلق پارٹی کے رہنما بلند ایجیوت وزیراعظم اور ملّی سلامت پارٹی کے رہنما نجم الدین اربکان نائب وزیراعظم تھے۔

وزیراعظم بلند ایجیوت

وہ اگرچہ بائیں بازو کے رہنما تھے لیکن عصمت انونو کے مقابلے میں جمہوریت پسند اور اعتدال پسند رہنما تھے۔ مذہب کے متعلق بھی ان کا طرزِعمل عصمت انونو کے طرزِعمل سے مختلف تھا، وہ مذہب یعنی اسلام کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے۔ جب 21 مارچ 1971ء کو سلیمان دیمرل کی حکومت کو فوج نے مستعفی ہونے پر مجبور کیا تو بلند ایجیوت نے اس اقدام کی مخالفت کی اور اسے فوجی انقلاب کے مترادف خیال کیا۔ اس طرح جب خلق پارٹی کے پارلیمانی گروپ نے عصمت انونو کی مدد سے نہاد ارم کی حکومت کی تائید کی، جن کو فوج نے مقرر کیا تھا تو بلند ایجیوت نے بطور احتجاج سیکرٹری جنرل کے عہدے سے استعفا دے دیا۔ مئی 1972ء میں خلق پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں عصمت انونو کو ایجیوت کے مقابلے میں شکست ہوئی اور انونو پارٹی کی صدارت سے مستعفی ہوگئے۔ اُن کی جگہ بلند ایجیوت خلق پارٹی کے صدر منتخب ہوئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ بلند ایجیوت ایک ایسے سوشلزم کے علمبردار تھے جس میں کمیونسٹوں کے لیے گنجائش نہ تھی۔ وہ نجی ملکیت کے خلاف نہیں تھے اور صرف بنیادی صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینے کے حامی تھے۔ سیاست میں وہ تشدد کے سختی سے مخالف تھے۔ وہ امریکہ پر ترکی کا انحصار کم کرنا چاہتے تھے۔ وہ شاعر، صحافی اور مصنف تھے۔ وہ کئی سال خلق پارٹی کے روزنامہ اُلُس (Ulus) کے ادارتی عملے میں شامل رہے۔ ''ملت'' اور دوسرے کئی بڑے اخباروں میں سیاسی کالم بھی لکھتے رہے۔

بلند ایجیوت نے جنوری 1974ء میں جو مخلوط حکومت بنائی، اس میں انہوں نے ملّی سلامت پارٹی سے تعاون کیا جو ترکی کی سیاسی جماعتوں میں سب سے زیادہ مذہبی جماعت ہے۔ بہرحال متضاد عناصر کا یہ تعاون سات آٹھ ماہ سے زیادہ نہیں چلا۔ اس دور میں ایک ایسا اہم واقعہ پیش آیا جو ترکی کے مستقبل پر آج تک اثر انداز ہو رہا ہے، یعنی جزیرہ قبرص میں ترک فوجوں کا داخلہ۔

مسئلۂ قبرص

قبرص کا مسئلہ کئی سال سے ترکی کی خارجہ پالیسی کا بہت اہم مسئلہ رہا ہے۔ اس جزیرے پر، جو ترکی کے جنوبی ساحل سے صرف ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے اور جس کے باشندوں کی اکثریت یونانی ہے، 1571ء میں ترکوں نے قبضہ کیا تھا۔ یہ قبضہ 1878ء تک رہا۔ اس کے بعد سیاسی مصلحتوں کے تحت یہ برطانیہ کے زیر انتظام آ گیا، لیکن آئینی بالادستی بدستور سلطنتِ عثمانیہ کی قائم رہی۔ 1914ء میں جب پہلی جنگ عظیم چھڑی تو برطانیہ نے قبرص پر قبضہ کر لیا۔ انیسویں صدی میں قبرص میں ترک مسلمانوں کی تعداد 40 فیصد تھی، لیکن برطانوی عہد میں مسلمانوں کی تعداد گھٹتی گئی اور اب صرف بیس فیصد رہ گئی ہے۔ یونانی باشندے جزیرے کا الحاق یونان سے کرنا چاہتے ہیں، جبکہ جزیرے کے ترک باشندے اس الحاق کے خلاف ہیں۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ قبرص تاریخ کے کسی بھی دور میں یونان کے تحت نہیں رہا، جبکہ وہ صدیوں تک ترکی کا حصہ رہا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی۔

ترکوں اور یونانیوں کی قدیم دشمنی کے پیش نظر جزیرے کے ترک باشندوں کو یہ خطرہ بھی ہے کہ اگر جزیرے کا یونان سے الحاق ہو گیا تو یونانی اُن کو ختم کر دیں گے۔ ترکی کو بھی یہ خطرہ ہے کہ اگر ایسا ہوا تو قبرص کے مسلمانوں کو ترکی میں پناہ حاصل کرنی پڑے گی، اور اس طرح مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ یہ مشکل حل کرنے کے لیے قبرص کے مسلمانوں نے یہ تجویز پیش کی کہ چونکہ ترک اور یونانی الگ الگ قومیں ہیں اور دونوں کا مذہبی، لسانی اور نسلی تشخص جداگانہ ہے، لہٰذا جزیرہ قبرص کو ترک اور یونانی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح ترکوں کا بھی تحفظ ہو جائے گا اور اگر یونانی اپنے حصے کا الحاق یونان سے کریں گے تو ترک بھی اپنے حصے کا الحاق ترکی کے ساتھ کرنے میں آزاد ہوں گے۔ اس مسئلے میں ترکوں اور یونانیوں میں 1955ء سے تصادم اور فسادات شروع ہو گئے تھے۔ خاص طور پر جب برطانیہ نے جزیرے کو آزادی دینے کا فیصلہ کیا تو جزیرے کی تقسیم کے مسئلے نے ایک نئی اہمیت اختیار کر لی۔

آخر کار ترکی، یونان، برطانیہ اور اہل قبرص کے درمیان طویل مذاکرات کے بعد 19 فروری 1959ء کو ایک نیا حل ڈھونڈ لیا گیا۔ قبرص کی تقسیم کی تجویز رد کر دی گئی اور قبرص کو آزاد مملکت قرار دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ معاہدے پر ترکی، یونان اور برطانیہ کے علاوہ قبرص کے یونانی اور ترک نمائندوں نے بھی دستخط کیے۔ معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں ترکی اور یونان دونوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنے مفادات کی خاطر جزیرے کے معاملات میں مداخلت کر سکتے ہیں۔

16/اگست 1960ء کو قبرص نے برطانیہ سے آزادی حاصل کر لی اور قبرص میں ایک نئے وفاقی طرز کی حکومت قائم کر دی گئی۔ معاہدے کے تحت قانون ساز اسمبلی میں ترکوں کو 30 فی صد نشستیں دی گئیں اور نائب صدر کے لیے ترک ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ لیکن آزادی کے بعد یونانیوں

نے جلد ہی معاہدے کی خلاف ورزی شروع کر دی اور ترکوں پر حملوں کا آغاز ہو گیا' جن میں بے شمار ترک مسلمان ہلاک اور ہزاروں بے گھر ہوئے۔ صورتِ حال اس قدر بگڑ گئی کہ ترکوں کے جان و مال کی حفاظت کی خاطر ترکی کو مداخلت کرنا پڑی اور اگست 1964ء میں یونانی حملہ آوروں کو منتشر کرنے کے لیے فضائی حملہ کرنا پڑا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کے دستے جزیرے میں تعینات کر دیے گئے۔

اس انتظام کے بعد جزیرے کے مسلمان باشندوں کو بظاہر تحفظ تو مل گیا' لیکن یونان سے الحاق کے حامی عناصر اپنی سازشوں میں مصروف رہے' یہاں تک کہ انہوں نے جولائی 1967ء میں صدر میکاریوس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ترکوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ یہ معاہدے کی سراسر خلاف ورزی تھی۔ چنانچہ ترکی کو جزیرے میں پھر مداخلت کرنی پڑی۔ بلند ایجیوت اُس وقت مخلوط حکومت کے وزیراعظم تھے۔ اُن کے حکم پر پہلی فضائی کارروائی کے ٹھیک دس سال بعد اگست 1974ء میں ترک فوجیں مسلمانوں کے تحفظ کی خاطر جزیرے میں اتار دی گئیں۔ ان فوجوں نے جزیرے کے شمال مشرقی حصے پر' جو کُل جزیرے کے 40 فیصد رقبے پر مشتمل ہے اور جہاں ترکوں کی بستیاں اور زمینیں ہیں' قبضہ کر لیا۔ دارالحکومت نکوسیا کے ایک حصے پر بھی ترکوں کا تسلط ہو گیا۔ قبرصی ترکوں نے اپنے رہنما رؤف دنکتاش (Denktash) کی قیادت میں یہاں اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی۔ ان کی اپنی ایک قانون ساز اسمبلی بھی بن گئی۔ ترکی نے یہ موقف اختیار کیا کہ اگر جزیرۂ قبرص کو متحد رکھنا ہے تو یہ ایک ایسی مکمل وفاقی حکومت ہی کی شکل میں ممکن ہے جس میں ترک اکثریت کے علاقے میں خودمختار حکومت اور خودمختار اسمبلی ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو قبرص میں مسلمان زندہ نہیں رہ سکیں گے اور یہ صورتِ حال ترکی کی سلامتی کے لیے خطرہ ہو سکتی ہے۔ قبرص کی ترک حکومت نے بندرگاہ مگوسہ کو ہر طرح کے ٹیکس اور چونگی سے آزاد بندرگاہ قرار دے دیا۔ مگوسہ اور ترکی کی بندرگاہ مرسین کے درمیان باقاعدہ جہاز رانی قائم کر دی گئی۔

قبرص میں وزیراعظم بلند ایجیوت کے دلیرانہ اقدام نے ان کو بہت مقبول بنا دیا۔ وہ ترکی کے ہیرو بن گئے۔ عوام نے ان کو فاتح قبرص اور دوسرا اتاترک قرار دیا' لیکن یہی مسئلہ مخلوط حکومت کی شکست کا باعث بنا۔ وہ اس طرح کہ بلند ایجیوت تو قبرص میں وفاقی حکومت کے حامی تھے' لیکن اُن کی اپنی مخلوط حکومت کی ایک جماعت ''ملی سلامت پارٹی'' قبرص کی تقسیم اور ترک حصے کا الحاق ترکی سے کرنا چاہتی تھی۔ اس مسئلے پر اختلاف اتنا شدید ہوا کہ 18 ستمبر 1974ء کو بلند ایجیوت مستعفی ہو گئے۔ (جاری ہے)